ماہنامہ

# حکمت بالغہ

## اپریل2010

## مدیر:انجینئر مختار حسین فاروقی

قرآن اکیڈمی

جھنگ پاکستان

فون اور فیکس:-0092-47-77628261

ای میل:hikmabaalgha@yahoo.com

ویب سائٹ:http://jhanghikmat.co.cc یا

http://hamditabligh.net

# فرمانِ خداوندی

## سورۃ الطّلاق (65)

سورۃ الطّلاق کے پہلے رکوع میں طلاق اور عدت سے متعلق بعض احکام کا بیان ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں طلاق وعدت سے متعلق آیات (227 تا 241) اس سورۃ سے پہلے نازل ہوچکی تھیں۔ اس سورۃ میں مزید مسائل کی وضاحت کرکے عائلی قانون کے اس شعبہ کی تکمیل کردی گئی ہے۔ یہاں اولاً یہ بیان ہوا کہ اگر (عدمِ موافقت کی بنا پر) مرد کو طلاق کا اختیار استعمال کرنا ہی پڑ جائے تو ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا کہ مرد طلاق کے کلمات بول کر عورت کو گھر سے نکال باہر کرے بلکہ اس کے لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے متعین کردہ قاعدے اور ضابطے (حدود اللہ) ہیں جن کی پابندی ہر امیر وغریب پر ضروری ہے۔ جو لوگ ناموافق حالات اور مشکلات کے باوجود اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی مقرر کردہ حدود پر عمل کریں گے اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانیاں پیدا کردے گا اور ان کے مال میں برکت دے گا اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں گے انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرتے بلکہ اپنی جان پر ہی ظلم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ جن مطلقہ مدخولہ عورتوں کو حیض آنا بند ہوگیا ہو یا ابھی تک حیض آنا شروع ہی نہ ہوا ہو ان کی اور حاملہ مطلقہ یا حاملہ بیوہ کی عدت کی مدت کیا ہوگی؟ اس عدت کے ایام کے نفقہ وسکونت کا انتظام اور جس بچے کے والدین طلاق کے ذریعے الگ ہوچکے ہوں اس کی رضاعت کا انتظام کس طرح ہوگا؟۔

دوسرے رکوع میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جن قوموں نے اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کی اس عائلی شعبہ میں بھی نافرمانی کی ہے اللہ نے انہیں سخت سزا دی ہے تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر ہے کہ اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر مسلمانوں کو تاریکی سے روشنی میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر وہ اس روشنی کی قدر کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی ابدی نعمتوں سے نوازے گا اور ناقدری کی صورت میں یاد رکھیں کہ

زمین و آسمان کی باشاہی اسی کی ہے اور وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔

سورۃ الطّلاق اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ (آیات 1-3)

(65) بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ

**اے پیغمبر ﷺ (مسلمانوں سے کہہ دو کہ) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو**

فَطَلِّقُوۡہُنَّ لِعِدَّتِہِنَّ

**تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو**

وَاَحۡصُوا الۡعِدَّۃَ

**اور عدت کا شمار رکھو**

وَ اتَّقُوا اللّٰہَ رَبَّکُمۡ

**اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے**

لَاتُخۡرِجُوۡہُنَّ مِنۡ بُیُوۡتِہِنَّ وَ لَا یَخۡرُجۡنَ

**(نہ تو تم ہی) ان کو (ایام عدت میں) ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ (خود ہی) نکلیں**

اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ

**ہاں اگر وہ صریح بے حیائی کریں (تو نکال دینا چاہیے)**

وَ تِلۡکَ حُدُوۡدُ اللّٰہِ

**اور یہ اللہ کی حدیں ہیں**

وَمَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَہٗ

**جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا وہ اپنے آپ سے ظلم کرے گا**

لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا O

**(اے طلاق دینے والے) تجھے کیا معلوم شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی صورت حال پیدا کر دے**

فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ

پھر وہ اپنی معیاد (یعنی تکمیل عدت) کے قریب پہنچ جائیں

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ

تو یا تو ان کو اچھی طرح سے (زوجیت میں) رہنے دو یا اچھی طرح سے علیحدہ کردو

وَّ اَشۡهِدُوۡا ذَوَىۡ عَدۡلٍ مِّنۡكُمۡ

اور اپنے میں سے دو انصاف پسند مردوں کو گواہ کرلو

وَ اَقِيۡمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ

اور (تم سب) اللہ کے لئے (درست) گواہی کو قائم کریں

ذٰلِكُمۡ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ

ان باتوں سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے

وَ مَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا O

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا' وہ اس کے لئے

(امتحان اور مشکلات سے) خلاصی کی صورت پیدا کردے گا

وَّ يَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ

اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو

وَ مَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ

اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کی کفایت کرے گا

اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ

اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کرنے والا ہے

قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَىۡءٍ قَدۡرًاO

اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے

صدق الله العظيم

حرفِ آرزو

## کاش مسیحی دنیا اور مشرکین (بھارت وغیرہ) صہیونی لابی کے ہاتھوں

# حضرت محمد ﷺ

## کی توہین کے لئے استعمال نہ ہوتے

انجینئر مختار فاروقی

آج کی جدید ترقی یافتہ اور جمہوری وآزاد مسیحی اقوام حضرت محمد ﷺ کی توہین کرنے سے باز نہیں آتیں اور موقع بہ موقع نئے انداز اور نئے نئے گوشوں سے سیرت خیر الانام سیدنا حضرت محمد ﷺ پر حملے کرتی ہیں۔ تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کریں تو ــــــــــــــــ مغرب اور مسیحی دنیا کا یہ مرض بڑا پرانا ہے اور ڈیڑھ ہزار سال قدیم ہونے کی بنا پر اس پر جہالت، بغض عناد، روایات اور سچ دشمنی جیسے دبیز پردے آگئے ہیں کہ آج کا مخلص مغربی نوجوان حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس ساری صورت حال کی ذمہ داری اُس ابلیسی قوت پر عائد ہوتی ہے جسے ''صہیونیت'' کا نام دیا جاتا ہے اور جو اپنے مذموم مقاصد کیلئے ہر قوم اور فرد کو TISSUE PAPER کے طور پر استعمال کرنے میں ماہر اور مشاق ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد سے بہت پہلے خود تورات کے بیان کے مطابق ہے اہل کتاب کا یہ شیطانی گروہ قتل انبیاء علیہم السلام جیسے جرم میں صرف ملوث ہی نہیں تھا بلکہ اس میں بڑا اجری اور بے باک تھا۔ انبیائے کرام علیہم السلام تو دنیا بھر کے لٹریچر میں بڑے معصوم اور حق پرست ہوتے تھے اور لوگوں کو نیکی اور سچائی کی تعلیم دیتے تھے تاہم ایسی معصوم ہستیوں کا قتل اس بات کا غماز ہے کہ یہ صہیونی قوت دنیا میں حق پرستی کا وجود ہی گوارا نہیں کر سکتی نیز حق وصداقت اور انسانی استحصال کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز ہی کو خاموش کر دینا چاہتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا بزعم خویش سولی چڑھوا دینا' حضرت محمد ﷺ کو پہچاننے کے باوجود ایمان نہ لانا بلکہ دشمنوں کو مدینے پر حملہ

کی بار بار دعوت دینا اور حضرت محمد ﷺ کے قتل کے دو دفعہ منصوبے بنا دینا اسی گندی سوچ کا نتیجہ تھا

8 ہجری (628ء) میں حضرت محمد ﷺ کا نامہ مبارک جب قیصر روم ہرقل کے دربار میں پیش ہوا تو اس نے عرب سردار (حضرت) ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کو بلا کر معلومات حاصل کیں اور مطمئن ہو کر وہ الفاظ کہے جو تاریخ میں سنہری حروف سے ثبت ہیں۔ ''اگر وہ ان اوصاف سے متصف ہیں تو وہ یقیناً پیغمبر ہیں ان کا اقتدار اس علاقہ تک پہنچے گا۔ میرے لئے ممکن ہوتا تو ان کے پاس جا کر ان کے پاؤں دھونا (اور ایمان لانا) اپنی سعادت سمجھتا۔''

اس مکالمہ کے بعد (مکہ واپسی پر (حضرت) ابوسفیان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) تو مسلمان ہو گئے مگر) تثلیث کے قائل مسیحی رہنماؤں نے ایسا شور مچایا اور ہیجان پیدا کر دیا کہ ہرقل کو اقتدار بچانے کی خاطر اسلام سے ہاتھ دھونے پڑے۔ کاش وہ کلمہ اسلام پڑھ لیتا اور حضرت محمد ﷺ کے قدموں میں آ جاتا تو تاریخ کا رُخ دوسرا ہوتا۔ کاش مسیحی دنیا کے اکابر اور اس کے پیچھے صیہونی قوت حضرت محمد ﷺ کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد پراپیگنڈے کا طوفان نہ کھڑا کرتے (جس کا مقصد مسیحی دنیا کو اسلام سے روکنا تھا) تو نہ بیت المقدس اُن کے ہاتھ سے جاتا اور نہ یورپ ایک ہزار سال تک DARK AGES میں رہتا)۔ اس دور کا تراشیدہ وہ جھوٹا پراپیگنڈا ہے جو حضرت محمد ﷺ کی کردار کشی کے لئے عام کیا گیا تھا آج بھی یورپ کے عوام اور مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کے ذہن سے محو نہیں ہو سکا جبکہ اس سے فائدہ صرف اور صرف صیہونیت اٹھا رہی ہے اور مسیحی دنیا کو اسرائیل کے تحفظ کے لئے استعمال کر رہی ہے۔ یہ قوت اس منصوبے پر بے دریغ پیسہ خرچ کر رہی ہے۔ صیہونیت کی اسلام دشمنی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن اور حضرت محمد ﷺ نے یہود کے ابلیسی منصوبوں اور شیطانی عزائم کو بے نقاب کیا ہے اور گذشتہ ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ میں واحد اور معتبر ترین شخصیت ہیں جنہوں نے صیہونیت کے انسانیت کش، استحصالی اور خدا بیزار خیالات سے انسانیت کو آگاہی بخشی ہے ———— یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر صیہونیت اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی دشمن ہے اور اُن کی توہین اور 'بزعم خویش' کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی بلکہ صدیوں پرانے جھوٹے پراپیگنڈے کو نئے نئے ناموں اور عنوانوں سے سامنے لاتے رہتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں ڈنمارک (اللہ اسے اور اس کے سرپرستوں کو غارت کرے آمین) سے اٹھنے والی توہین رسالت ﷺ کی یہ مہم اسی طویل تاریخی تسلسل کی کڑی ہے۔ اس سلسلے کو ختم کرنے کے لئے دیگر وسائل و ذرائع کے استعمال کے ساتھ ساتھ اصلاً ''یہودی صہیونی ذہن'' اور اس کی ماں ''اسرائیل'' کو لگام دینا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں ''مکالمہ بین المذاہب'' کے کارپردازان اور علمبرداران، کاش مسیحی دنیا کو یہی باور کرادیں کہ وہ اپنے ہاں تعلیمی اداروں اور مذہبی اداروں میں (جیسے ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام ادب سے لیتے ہیں) وہ حضرت محمد ﷺ کو اپنے تئیں پیغمبر نہ سہی بھلا انسان ہی کے طور پر متعارف کرادیں تو مسیحی دنیا کی نئی نسلیں توہین رسالت کی بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جب تک صہیونیت کا وجود ختم نہیں ہو جاتا اس وقت تک توہین رسالت ﷺ جیسے جرائم کی بیخ کنی نہیں ہوسکتی لہٰذا ——————
دیگر امور کے ساتھ ساتھ اس پہلو پر توجہ از حد ضروری ہے۔

# خودی اور سائنس

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب

کی کتاب "حکمت اقبال" کا ایک باب

## سائنسی تحقیق کا اصل ماخذ

مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ تمام سائنسی علوم کی بنیاد ہے۔ مشاہدۂ قدرت کے لئے دنیا میں سب سے پہلی مؤثر آواز جو بلند ہوئی وہ قرآن حکیم کی آواز تھی جس کا ارشاد یہ تھا کہ مظاہر قدرت خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں؛ کیونکہ ان میں خدا کی صفات جلوہ گر ہیں۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اپنے خالق کو پہچانے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سب سے پہلے سائنس دان جنہوں نے سائنسی طریق تحقیق ایجاد کیا تھا اور سائنسی علوم کی بنیاد رکھی تھی، مسلمان تھے، ان کا مشاہدہ اور مطالعہ قدرت خدا کی معرفت کے لئے تھا۔ لہٰذا خدا کا عقیدہ ان کی سائنس کا مدار اور محور تھا۔ علم وحکمت کے میدان میں قدیم اہل یونان کے کمالات مسلّم ہیں لیکن یونانی حکماء مشاہدہ قدرت کو نظر انداز کر کے اپنا سارا زور فقط خیالات اور تصورات پر صرف کرتے تھے؛ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ سائنسی طریق تحقیق کے موجد بن سکتے۔ اس سلسلہ میں اقبال لکھتا ہے:

> ''یہ بات قطعاً غلط ہے کہ تجرباتی طریق تحقیق یورپ کی ایجاد ہے...... یورپ نے اس بات کا اعتراف کرنے میں بڑی دیر کی ہے کہ اس کے ہاں کے مروّج سائنسی طریق تحقیق کا اصل ماخذ اسلام ہے۔ تاہم اس بات کا مکمل اعتراف ہو کر رہا ہے۔''

اس کے بعد اقبال برفالٹ (BRIFFOULT) کی کتاب ''تعمیر انسانیت'' (THE MAKING OF HUMANITY) سے کچھ عبارتیں اس بات کے ثبوت میں نقل کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یونانی فلسفہ کے اثر سے مسلمان عرصہ دراز تک روحِ قرآن سے غافل رہے۔ لیکن بالآخر انہوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اقبال لکھتا ہے:

''سقراط کے صحیح شاگرد کی حیثیت سے افلاطون حسی تجربات سے جو اس کے خیال میں سچے علم کی طرف نہیں بلکہ فقط کسی رائے کی طرف راہنمائی کرتے تھے، نفرت کرتا تھا۔ کسی قدر مختلف ہے یہ نقطۂ نظر قرآن سے جو سننے اور دیکھنے کی قوتوں کو خدا کے نہایت ہی قیمتی انعامات سمجھتا ہے اور ان کو اس دنیا میں اپنی اپنی کارکردگی کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کا مطالعہ کرنے والے مسلمانوں نے یونانی فلسفہ کے اثر کی وجہ سے شروع میں بالکل نہیں سمجھا۔ وہ قرآن کو یونانی فکر کی روشنی میں پڑھتے تھے۔ انہیں یہ حقیقت سمجھنے کے لئے (اور وہ بھی پوری وضاحت سے نہیں) کہ قرآن کی روح دراصل یونانی فلسفہ سے متعارض ہے، دوسو سال سے بھی اوپر لگ گئے اور پھر اس حقیقت سے روشناس ہونے کا نتیجہ ایک قسم کی ذہنی اور علمی بغاوت میں رونما ہوا جس کی پوری اہمیت آج تک نہیں سمجھی گئی''۔

''لیکن قلبی واردات انسانی علم کا فقط ایک ذریعہ ہے قرآن کے نقطۂ نظر سے علم کے دو اور ذرائع بھی ہیں۔ یعنی قدرت اور تاریخ (آگے چل کر اقبال تاریخ کو بھی قدرت میں شمار کر لیتے ہیں کیونکہ تاریخی واقعات بھی انسانی دنیا میں قدرت کے مظاہر ہیں۔ مصنف) اور جب قرآن علم کے ان سرچشموں سے کام لیتا ہے تو اس کی حقیقی روح پوری شان و شوکت سے بے نقاب ہوتی ہے۔ قرآن سورج اور چاند میں، سایوں کے دراز ہونے میں، رات اور دن کے تغیرات میں، انسان کے الوان اور السنہ کے اختلافات میں، دولت مندی اور مفلسی کے ایام کی گردش میں، غرضیکہ قدرت کے ان تمام مظاہر میں جو انسان کے حواس کے روبرو جلوہ افروز ہیں حقیقت مطلقہ کے نشانات کا مشاہدہ کرتا ہے اور مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ان نشانات پر غور و فکر کرے اور

ان سے اس طرح سے نہ گزر جائے کہ گویا وہ بہرا اور اندھا ہے کیونکہ جو شخص اس دنیا میں ان چیزوں کو نہیں دیکھتا وہ اگلی زندگی کے حقائق کی طرف سے بھی اندھا رہے گا۔ مطالعہ قدرت کی یہ دعوت اس حقیقت کے تدریجی انکشافات کے ساتھ مل کر کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق کائنات اپنی اصل کے اعتبار سے متحرک اور محدود اور ترقی پذیر ہے آخر کار یونانی فلسفہ کے ساتھ (جس کا مطالعہ مسلمانوں نے اپنے دور کی ابتدائی منزلوں میں نہایت ذوق وشوق سے کیا تھا) مسلمان مفکرین کے تصادم کا باعث ہوئی۔ یہ نہ جاننے کی وجہ سے کہ قرآن کی روح دراصل فلسفہ یونان سے متصادم ہوتی ہے اور یونانی فلسفہ پر اعتماد کرنے کی وجہ سے ان کا پہلا ردعمل یہ تھا کہ وہ فلسفہ یونان کی روشنی میں قرآن کو سمجھیں۔ روحِ قرآن کی حقائق پسندی کے پیش نظر اور یونانی فلسفہ کی خیال پرستی کی وجہ سے جو تصورات سے شغف رکھتا تھا اور حقائق کو نظر انداز کرتا تھا۔ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ ناکامی کے سوائے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس ناکامی کے بعد جو کچھ ہوا وہی ہے جس نے اسلامی تہذیب کی حقیقی روح کو آشکار کیا اور تہذیب حاضر کے بعض نہایت اہم عناصر کی بنیاد قائم کی۔''

مسلمان سائنس کے موجد اس لئے بنے تھے کہ ان کے سامنے قرآن حکیم کا یہ ارشاد تھا کہ خدا کی معرفت کے لئے قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں؛ لہٰذا خدا کا عقیدہ ان کی سائنس کا مرکزی یا بنیادی تصور تھا۔

## عیسائیت کا نقطۂ نظر

جب اندلسی مسلمانوں کے سیاسی حالات نے پلٹا کھایا اور اندلس سے نکلنے پر مجبور ہوئے تو سائنس یورپ کے ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو...... جدید عیسائیت کے پیروکار تھے چونکہ ان لوگوں نے نادانی سے فرض کر لیا تھا کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک پاک اور مقدس اور دوسری ناپاک اور غیر مقدس۔ لہٰذا انہوں نے سمجھا کہ کائنات کے مشاہداتی علم کو جسے سائنس کہا جاتا ہے، خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ سائنس اور سائنس دانوں سے کلیسا کی گہری اور آشکار دشمنی نے اس فرضی عقیدہ کے لئے مزید ثبوت بہم پہنچایا اور کلیسا اور ریاست کے افتراق نے جو

دونوں کے شدید اور طویل جھگڑوں کے بعد ایک اٹل حقیقت کے طور پر رونما ہوا تھا اس عقیدہ کو مزید تقویت پہنچائی اور اس کے لئے راستہ صاف کیا۔ لہٰذا اس عقیدہ نے جامہ عمل پہنا اور سائنس سے خدا کا نام خارج کر دیا گیا یہ کلیت وجود میں تفریق پیدا کرنے اور حقیقت کائنات کو دو مختلف حصوں میں تقسیم کرنے کی ایک نامعقول اور افسوسناک جسارت تھی جس کے پیچھے کوئی عقلی، علمی یا سائنسی دلیل یا شہادت موجود نہ تھی۔ تاہم سائنس کی بے خدائیت کا عقیدہ جو اس طرح عیسائیت کے بطن سے پیدا ہوا تھا' عیسائی مغرب کی دنیا میں جڑ پکڑ گیا۔ ظاہر بات ہے کہ سائنس میں اس عقیدہ کے جاگزیں ہونے کے بعد کوئی ایسے سائنسی نظریات پیدا نہ ہو سکتے تھے جو اس سے مطابقت نہ رکھتے ہوں لہٰذا ایسے سائنسی نظریات وجود میں آنے لگے جو دراصل اسی کی پیداوار تھے لیکن جن کو آسانی سے اس کا ثبوت سمجھا جا سکتا تھا۔ ایسے سائنسی نظریات میں ہم انیسویں صدی کی طبقاتی مادیت اور میکانیت اور ڈارون کے مادی اور میکانکی نظریہ ارتقا کو شمار کر سکتے ہیں جنہوں نے اس خیال کو بظاہر ایک سائنسی حقیقت کا درجہ دیا کہ قدرت میں کوئی تخلیق یا راہ نما قوت کارفرما نہیں اور خدا کا عقیدہ مظاہر قدرت کی تشریح کے لئے غیر ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ رفتہ رفتہ بھول گئے کہ سائنس کی بے خدائیت درحقیقت ایک مذہبی عقیدہ ہے جس کو عیسائیت نے جنم دیا تھا اور یہ سمجھنے لگے کہ یہ خود سائنس ہی کی ایک ضرورت ہے۔ اب بھی عیسائی مغرب کے سائنس دان یہ کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ اپنی سائنس کو ہر حالت میں اس راستہ سے بچائیں جو خدا کے عقیدہ کی طرف جاتا ہے۔ اور خواہ کچھ ہو جائے اس کو سختی کے ساتھ اس چار دیواری میں بند رکھیں جو سائنس کی بے خدائیت کے نامعقول عقیدہ نے اس کے اردگرد بنا رکھی ہے۔

## مظاہر قدرت آیات اللہ ہیں

ان کی روش سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے خدا اور مذہب کے خلاف ایک سازش کر رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ایسے حقائق کو نظرانداز کرتے ہیں جو قدرت میں کسی ذہنی یا تخلیقی قوت سے عمل کا ثبوت بہم پہنچاتے ہوں۔ خواہ وہ ثبوت کیسا ہی بیّن اور آشکار کیوں نہ ہو مثلاً وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ قدرت میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جو کسی ذہن کی تخلیقی کاروائی کا پتہ دیتی ہیں مثلاً ترتیب، تنظیم، تجویز، تعمیر، تکمیل، وحدت، یکسانیت، تسلسل، مقصدیت، تطابق،

توافق ریاضیاتی فکر، زندہ حیوانات کی خودکارانہ نشو ونما جوان کو برتر اور بلند تر مدارج حیات کی طرف خود بے خود لے جاتی ہے۔ اگر یہ اوصاف قدرت کے اندر موجود نہ ہوتے تو قدرت میں کسی چیز کا وجود ہی نہ ہوتا اور طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم ممکن نہ ہوتے۔ اس کے باوجود مغرب کے سائنس دان ان کے وجود سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور ان کی کوئی تشریح کر ہی نہیں سکتے۔ اگر وہ بعض وقت ان میں سے بعض حقائق کی تشریح کے لئے سخت مجبور ہو جائیں تو پھر بھی ان کی تشریح کے لئے خدا کے تصور کو کسی حالت میں بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ کچھ من گھڑت فرضی مابعد الطبیعیاتی تصورات کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے کچھ حقائق کی تشریح کے لئے جیمز جینز کسی ریاضیاتی ذہن کو فرض کرتا ہے، برگساں کسی قوت حیات کا نام لیتا ہے اور ڈریش کسی عالمی اسکیم یا انٹی لیچی کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ تمام فرضی ہونے کے علاوہ ناکافی اور ناتسلی بخش ہیں۔ مثلاً کیا یہ ممکن ہے کہ کائنات میں کوئی اعلیٰ درجہ کا ریاضیاتی ذہن تو کارفرما ہو لیکن اس میں شخصیت کے اور اوصاف جو جذبات اور اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں موجود نہ ہوں یا قدرت میں کوئی ایسی قوت اجسامِ حیوانات کی تخلیق اور تکمیل کے کاموں میں مصروف ہو جو سوچتی سمجھتی ہو، اپنے مقاصد سے آگاہ ہو اور ان کو حاصل کرنے کی قدرت رکھتی ہو لیکن ایک کامل شخصیت نہ ہو۔ ہمارا تجربہ اس قسم کے ادھورے تصورات کی نفی کرتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضیاتی فکر یا مقصدیت کے اوصاف جس وجود میں پائے جاتے ہوں وہ شخصیت کے باقی ماندہ جذباتی اور اخلاقی اوصاف سے بے بہرہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ قدرت میں جو ریاضیاتی ذہن یا قوت حیات کارفرما ہے وہ خودی عالم یا خدا ہی ہے لیکن سائنس کی بے خدائیت کا غیر عقلی عقیدہ مغرب کے سائنس دانوں کو یہ بات سمجھنے سے مانع ہے۔

## علم کی نیام بے شمشیر

سائنس کی بے خدائیت پر اقبال بڑے افسوس کا اظہار کرتا ہے اور پُر درد الفاظ میں کہتا ہے کہ:

ے
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

اس شعر میں اور اس قسم کے دوسرے اشعار میں علم سے اقبال کی مراد سائنس ہے اور دوسرا کوئی علم نہیں۔ چنانچہ وہ خود اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

''علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارومدار حواس پر ہے۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے ایک طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر دین کے ماتحت نہ رہے تو شیطنت ہے۔ یہ علم علم حق کی ابتداء ہے۔''

اقبال کے اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عشق الٰہی کی تیغ جگر دار سائنس کی نیام کے اندر اپنی جگہ پر موجود تھی اور بعد میں یہ افسوسناک حادثہ پیش آیا کہ کسی نے اس تلوار کو جو دنیا بھر کے تمام باطل تصورات اور نظریات کاٹ کر رکھ سکتی تھی اس نیام سے اڑا لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ نیام اب تک خالی پڑی ہے۔ یہ تیغ جگر دار کیسے اڑ گئی اور کس نے آڑائی؟ اقبال اس سوال کا جواب اپنے اشارہ کو بلیغ اور مؤثر بنانے کے لئے سننے والوں پر چھوڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اقبال سائنس کی بے خدائیت کے اس تاریخی پس منظر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے۔ اس تیغ جگر دار کو اڑانے کی ساری ذمہ داری مغرب کی کوتاہ اندیشی اور مسلمان سائنس دانوں کی کورانہ تقلید پر عائد ہوتی ہے۔

## علم حق کا پہلا مرحلہ

اگرچہ بے خدا سائنس الفاظ میں نہیں کہتی کہ خدا موجود نہیں۔ لیکن انسان اور کائنات کے متعلق اس کا نکتہ نگاہ اور اس کا طریق فکر و عمل ایسا ہے کہ گویا خدا موجود نہیں۔ وہ تمام طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ اس طرح سے کرتی ہے کہ گویا ان کا کوئی خالق نہیں اور اگر ہے تو ان کے ساتھ اب اس کا کوئی تعلق نہیں اور اس کی صفات کا کوئی نشان ان کے اندر موجود نہیں۔ اس طرح سے مغربی سائنس اس ایک ہی دروازہ کو بند کر دیتی ہے جس کی راہ سے خدا کی معرفت کا نور سب سے پہلے حضرت انسان تک پہنچتا ہے۔ اقبال کا یہ خیال قرآن حکیم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے کہ خدا کی معرفت اور محبت کو پیدا کرنے کا پہلا ذریعہ انسان کے حواس ہیں جن کی مدد سے وہ مظاہر قدرت میں خدا کی صفات کا مشاہدہ کرتا جو قدرت کا مشاہدہ کرنے کے

بغیر ہم خالق، رب، رحیم، کریم، عادل، حفیظ، علیم، سمیع اور بصیر، مؤمن، مہیمن ایسے الفاظ کے معنی نہیں سمجھ سکتے جو اوصاف باری تعالیٰ کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو سمجھنے کے بغیر خدا کی معرفت یا محبت یا اطاعت یا عبادت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان سے قرآن حکیم کا سب سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرے۔ حواس کے بعد خدا کی معرفت کا دوسرا ذریعہ ذکر ہے جس کی مدد سے ہر انسان قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بغیر اور مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ کر بھی خدا کی صفات پر غور و فکر کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ قدرت کے مشاہدہ سے ان الفاظ کے معنی سمجھ چکا ہوتا ہے جو خدا کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اس ذکر کی کثرت سے خدا کے حضور یا قرب کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس قلب کی ایک کیفیت ہے جو عشق یا محبت سے تعلق رکھتی ہے اور شعور اور ادراک سے بالا ہے۔ اقبال نے اس مطلب کو ایک شعر میں ادا کیا ہے۔

علم حق اوّل حواس آخر حضور

آخر او مے نگنجد در شعورؑ

ایک اور جگہ اقبال ذکر اور فکر کی حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام

وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء

مقامِ ذکر کمالات رومی و عطار

مقام فکر مقالات بوعلی سینا

مقام فکر ہے پیمائش زمان و مکان

مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

## علم بے عشق کے خطرناک نتائج

بے خدا سائنس خدا کا انکار کرنے کے بغیر خدا کو نظر انداز کرتی ہے وہ دوسرے انسانوں کو بھی اس طرح سے سوچنے اور کام کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ گویا خدا موجود نہیں اور یہ نقطۂ نظر خدا کے انکار سے بدتر ہے۔ بے خدا سائنس نے ہی اس نامعقول اور بے بنیاد عقیدہ کو رواج دیا ہے کہ

معیاری فلسفہ وہی ہے جس میں خدا ایک حقیقت کے طور پر مذکور نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں کائنات کے جس قدر فلسفے پیدا ہوئے ہیں مثلاً ڈارونزم، مارکسزم، میکڈوگلزم، فرائڈزم، ایڈلرزم، بی ہیویرازم، لاجیکل پازیٹوزم، ہیومنزم وغیرہ وہ سب بے خدا ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بے خدا سائنس کے اس زمانہ میں انسانی فطرت اور انسانی افعال و اعمال کے جس قدر نظریات وجود میں آئے ہیں وہ بھی سب کے سب بے خدا ہیں مثلاً بے خدا فلسفہ سیاست، بے خدا فلسفہ اخلاق، بے خدا اقتصادیات، بے خدا قانون، بے خدا فلسفہ تعلیم، بے خدا فلسفہ تاریخ، بے خدا نفسیاتِ فرد، بے خدا نفسیاتِ جماعت۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہونا کوئی معمولی سا معصوم سا اور بے ضرر سا حادثہ نہیں جو صرف کتابوں میں ہی رونما ہوا ہو۔ اس نے انسان کی کتابوں کو ہی نہیں بدلا بلکہ اس کے مقصدوں، قدروں، منصوبوں، امیدوں، آرزوؤں اور حق و باطل، خوب و زشت اور نیک و بد کے پیمانوں اور معیاروں کو بدل کر اس کے اعمال و افعال کو بھی بدل ڈالا ہے۔ انسان اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے وہی کرتا ہے اگر اس کے افکار و آراء اور تصورات اور نظریات بے خدا ہوں تو پھر اس کے اعمال و افعال کا بے خدا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا سائنس کا بے خدا ہو جانا عالم انسان کا بہت بڑا حادثہ ہے جس نے تاریخ کا رخ موڑ دیا ہے اسی کی وجہ سے اب دنیا میں کوئی ایسی ہمہ گیر اخلاقی اور روحانی قوت باقی نہیں رہی جو اندر سے انسانی اعمال کو ضبط میں لا کر صحیح راستہ پر ڈال سکے۔ یہی حقیقت ہے جو دور حاضر کے انسان کی تمام بدقسمتیوں اور پریشانیوں کا موجب ہے۔ مثلاً آزاد جنسیت کی وجہ سے اہلی زندگی کا بگاڑ، طفولیتی بے راہ روی، علم اور استاد کے احترام کا زوال اور علمی درسگاہوں کے ضبط و نظم کا فقدان، اقتصادی خوشحالی کے باوجود اطمینانِ قلب سے محرومی، ذہنی بیماریوں، خودکشیوں اور جرموں کی روز افزوں تعداد، سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب، سیاسی سازشیں اور ان سے پیدا ہونے والے سیاسی قتل اور سیاسی انقلابات، قومی اور بین الاقوامی معیار اخلاق کی پستی، میزائیلوں اور ایٹم بموں کے چڑھتے ہوئے انبار، عالمگیر جنگوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے میں نہیں آتا۔ اگر سائنس باخدا ہو جائے تو یہ سب مقاصد اور مصائب ختم ہو جائیں اور آسمان کے نیچے ایک ارضی جنت وجود میں آ جائے۔

## سائنس اور عشق کی گفتگو

اقبال نے اس مضمون کو سائنس اور عشق کی ایک گفتگو کی صورت میں بیان کیا ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ میری نگاہ پوری کائنات کی راز دار ہے اور زمانہ میری کمند میں گرفتار ہے۔ میری آنکھیں اس مادی کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں مجھے آسمان سے اس طرف کی دنیا یعنی عالم مابعد الطبیعیات سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے ساز سے سینکڑوں نغمے بلند ہوتے ہیں اور میں اپنے دریافت کیے ہوئے رازہائے سربستہ کو سر بازار لے آتی ہوں تا کہ ہر شخص ان کو پرکھ سکے اور ان سے مستفید ہو سکے۔

نگاہم رازدارِ ہفت و چار است　　گرفتارِ کمندم روزگار است
جہاں بینم بایں سو باز کردند　　مرا باآنسوئے گردوں چہ کاراست
چکد صد نغمہ از سازے کہ دارم　　بازار افگنم رازے کہ دارم

عشق جواب دیتا ہے کہ تمہاری افسوں گری سے سمندر شعلہ زار بنے ہوئے ہیں (مراد بحری جہازوں کی گولہ باری سے ہے) ہوا آگ برساتی ہے (مراد ہوائی جہازوں کی بمباری سے ہے) اور زہر آلود ہے (زہریلی گیس کی طرف اشارہ ہے)۔ جب تک میرے ساتھ تیری دوستی تھی تو ایک نور تھی مجھ سے الگ ہونے کی دیر تھی کہ تیرا نور آگ بن گیا تو روحانیت کے خلوت خانہ میں پیدا ہوئی تھی (مراد یہ ہے کہ مسلمانوں نے تجھے خدا کی معرفت کی جستجو میں ایجاد کیا تھا) لیکن تو شیطان کے جال میں پھنس گئی (یعنی خدا کے تصور کو ترک کرنے اور باطل تصورات حقیقت کو اپنانے کی وجہ سے)۔ آ ہم دونوں مل کر اس خاکی کائنات کو گلستان بنائیں آسمان کے نیچے ایک ایسا بہشت بنائیں جو ہمیشہ قائم رہے۔ آ میرے درد دل سے ایک ذرہ لے لے (یعنی خدا کے عقیدہ کو قبول کر لے) اور اس جہاں پیر کو پھر جوان بنادے ہم روز ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ایک ہی نغمہ (یعنی خدا کی محبت کے نغمہ) کے زیر و بم ہیں۔

زافسونِ تو دریا شعلہ زار است　　ہوا آتش گذار و زہر دار است
چو با من یار بودی، نور بودی　　بریدی از من و نورِ تو نار است
بخلوت خانۂ لاہوت زادی　　ولیکن در نخِ شیطان فتادی
بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز　　جہانِ پیر را دیگر جواں ساز

بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر　　تہِ گردوں بہشت جاوداں ساز

زروز آفرینش ہمدم استیم　　ہماں یک نغمہ راز یروبم استیم

جب انسان کے تمام اعمال کی قوت محرکہ خدا کی محبت ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا جو کام بھی خدا کی محبت کی تسکین اور تشفی کے لئے نہ ہوگا محض بے سود ہوگا۔ سائنس اگر خدا سے بے تعلق ہوگی تو وہ بیکار خیالات کا تماشہ خانہ ہوگی' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

علم کو از عشق برخوردار نیست　　جز تماشہ خانہ افکار نیست

بلکہ ایسی سائنس چونکہ سچے تصور حقیقت سے کٹ جاتی ہے وہ لازماً کسی جھوٹے تصور حقیقت پر مبنی ہو جاتی ہے۔ اس سے شیطانی قوتوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور انسان کے اصلی مقاصد کو نقصان پہنچتا ہے۔

علمِ بے عشق از طاغوتیاں　　علم باعشق از لاہوتیاں!

## خدا ہستی غائب نہیں

ایک نظم میں اقبال کہتا ہے کہ فلسفہ مغرب کے قائلین کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی جستجو کرنا نادانی ہے اور ان کی بڑی دلیل یہ ہے کہ خدا ہستی غائب ہے اور جدید سائنسی علوم کی بنیاد ان حقائق پر ہے جو محسوس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں یعنی حواس خمسہ کے ذریعہ سے معلوم کیے جاسکتے ہیں لہٰذا خدا کو ماننا علم اور عقل کی کوئی بات نہیں، اس زمانہ میں محض عقائد کو کوئی علمی حیثیت حاصل نہیں۔ مذہب ایک جنون ہے جس سے آدمی کے تخیل پر ناحق ایک لرزہ سا طاری رہتا ہے۔ لیکن اگر ہم فلسفہ زندگی پر غور کریں تو کچھ اور ہی قسم کے حقائق آشکار ہوتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب کے فلسفیوں کا یہ خیال درست نہیں کہ خدا ہستی غائب ہے۔ اور خدا کو جاننے کا پہلا ذریعہ حواس خمسہ کے سوائے کوئی اور بھی ہے۔ خدا کو جاننے کا بنیادی ذریعہ حواس خمسہ ہی ہیں کیونکہ خدا کی ہستی اور اس کی صفات مظاہر قدرت میں آشکار ہیں اور مظاہر قدرت کا علم حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے اپنے خط میں لکھا ہے: وہ علم جس کا دارومدار حواس پر ہے ''علم حق کی ابتداء ہے۔'' ع　　علم حق اول حواس آخر حضور

چونکہ خدا کی صفات محسوس کائنات میں آشکار ہیں لہٰذا خدا محسوس کائنات سے الگ

نہیں اور خدا کا علم بھی محسوس کائنات ہی کا علم ہے۔ یہ بات کہ خدا ہماری جسمانی آنکھوں سے مخفی ہے' اس صداقت میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتی۔ بعض اوقات ہم کسی چیز کی ہستی کو اس کے محسوس آثار اور نتائج سے جانتے اور پہچانتے ہیں اور پھر اس چیز کا علم بھی ایسا ہی معتبر اور یقینی ہوتا ہے جیسا کہ کسی اور محسوس چیز کا علم مثلاً ہم دور سے دھواں دیکھیں تو اس سے آگ کی موجودگی کا یقین کرتے ہیں حالانکہ آگ ہمیں نظر نہیں آتی' اسی طرح سے ہم اپنے کسی دوست کی شخصیت یا خودی کو اس کے آثار و نتائج سے جو اس کے اعمال، افعال اور اقوال کی صورت اختیار کرتے ہیں اچھی طرح سے جان لیتے ہیں حالانکہ اس کی شخصیت یا خودی ہمیں نظر نہیں آتی۔ ایٹم کو کسی سائنس دان نے عریاں نگاہوں سے آج تک نہیں دیکھا اور خوردبین سے بھی ہیروشیما کے دھماکہ کے بعد ہی دیکھا ہے۔ اس کے باوجود اس دھماکہ کے وقت سائنس دانوں کو اس کے محسوس آثار و نتائج کی بنا پر اس کا پورا علم تھا جو یہاں تک یقینی اور موثر تھا کہ اس کی مدد سے ہیروشیما ایسے ایک بڑے شہر کو لمحہ بھر میں تباہ کر دیا گیا۔ ایٹم کی طرح ہم خدا کو بھی اس کے آثار و نتائج یا اعمال و افعال کے ذریعہ سے جو مظاہر قدرت کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں' جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اوپر کی مثالوں میں اگر اپنے آثار و نتائج کے ذریعہ سے جانی ہوئی چیزوں (یعنی آگ اور دوست کی شخصیت اور ایٹم) میں سے کوئی چیز بھی کسی شخص کے نزدیک ہستی غائب یا مافوق الفطرت (SUPER-NATURAL) نہیں تو خدا بھی ہستی غائب یا مافوق الفطرت نہیں۔ تمام طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی مظاہر قدرت میں جو چیز ہمیں واضح طور پر نظر آتی ہے وہ نظم یا آرڈر (ORDER) کی موجودگی ہے جو سائنس دان کوشش کرتا ہے اور جسے سائنس دان اپنے مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ سے دریافت کر کے ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ جہاں نظم دریافت نہ ہو سکے وہاں سائنس کی تحقیق ناکام رہتی ہے اور رک جاتی ہے مثلاً: ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نظم ایک جوہر میں، ایک سالمہ میں، ایک قلم یا کرسٹل میں، ایک نظام شمسی میں، برف کے ایک گالہ میں، ایک خلیہ میں، ایک جسم حیوانی میں اور ایک انسانی شخصیت میں موجود ہے۔ اور پھر جہاں تک ہمیں علم ہے یہ نظم جب سے کائنات وجود میں آئی ہے آج تک ہر زمانہ میں اور جہاں تک کائنات پھیلی ہوئی ہے اس میں ہر جگہ ایک ہی رہتا ہے اور اس کی یکسانیت کبھی اور کہیں نہیں ٹوٹتی۔ اب یہ بات بالکل ظاہر ہے اور اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ نظم

ہمیشہ کسی ذہن کی کاروائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ہم گندم کے کچھ دانے ایک فٹ باتھ پر بکھرے ہوئے دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اتفاقاً گر گئے ہوں گے لیکن اگر وہی دانے ایک باقاعدہ ہشت پہلو ریاضیاتی شکل میں آراستہ ہوں تو ہم سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکیں گے کہ کسی زندہ باشعور ہستی نے ان کو یہ شکل دی ہے۔ طبیعیاتی مظاہر قدرت کے اندر جو نظم پایا جاتا ہے وہ اس قدر، جچا تلا ہے کہ ہم اسے ریاضیاتی اصطلاحات یا ریاضیاتی اصولوں میں ظاہر کرسکتے ہیں۔ ایک بلند عمارت کی چھت سے نیچے گرائی ہوئی چھوٹی سی کنکری کی بڑھتی ہوئی رفتار یا حرارت سے پھیلنے والی لوہے کی ایک سلاخ کی بڑھتی ہوئی طوالت بھی ریاضیاتی قوانین کی پابند ہے جو کائنات میں اس وقت بھی جاری تھے جب اس میں انسان - جو ان قوانین کو سمجھنے کی ذہنی استعداد رکھ سکتا ہے- موجود نہیں تھا۔ اگرچہ نظم خود ایک مقصد کا مظہر ہوتا ہے تاہم جب ہم طبیعیاتی مظاہر قدرت سے ذرا اوپر آ کر حیاتیاتی مظاہر قدرت پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ہر چھوٹے یا بڑے جاندار کے جسمانی نظم کے اندر کسی مقصد کی کارفرمائی براہ راست نظر آتی ہے حالانکہ کسی جاندار نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا اور نہ وہ مقصد جو اس کے جسمانی کارخانہ کے کونے کونے میں کام کرتا ہوا نظر آتا ہے' اس کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔ لہٰذا جدید سائنسی علوم مظاہر قدرت کے اندر نظم اور مقصد کی جستجو اور دریافت کی کٹھن منزلیں طے کر کے یہ سوال بار بار پیدا کرتے رہتے ہیں کہ جب نظم اور مقصد کسی ذہن کی کارفرمائی کے بغیر ممکن نہیں تو پھر یہ کس کا ذہن ہے جو قدرت کے ذرہ ذرہ میں کارفرما ہے؟۔ اس سوال کا جواب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ یہ اس کا ذہن ہے جس نے قدرت کے ذرہ ذرہ کو پیدا کیا ہے اور جسے خالق کائنات یا خدا کہا جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کا عقیدہ جدید سائنسی علوم کا ایک قدرتی جزو اور جزو لاینفک ہے۔ اگر مغرب کے علماء نے علوم جدیدہ سے خدا کے عقیدہ کو الگ کردیا ہے تو ایسا کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی علمی اور عقلی وجہ جواز موجود نہیں اور نہ ان کا ایسا کرنا اس کا ثبوت بن سکتا ہے کہ خدا ایک علمی تصور نہیں یا ہمیں خدا کو ایک غیر محسوس ہستی سمجھ کر نظر انداز کردینا چاہیے۔ خدا کی ہستی' ہستی غائب یا ماورائے علم ہستی نہیں بلکہ وہ ہستی ہے جس کی شہادت خود علوم جدیدہ بہم پہنچا رہے ہیں۔ اگر خدا غائب ہے تو ان معنوں میں کہ آشکار ہونے کے باوجود اس کی ذات ہماری جسمانی آنکھوں سے مخفی ہے لیکن ان معنوں میں دنیا کی ہر وہ چیز بھی جسے ہم ان

آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں' غائب ہے۔ کیونکہ ہم دنیا کی کسی چیز کو بھی جسے ہم مرئی کہتے ہیں پوری طرح سے نہیں جان سکتے۔ ان ہی معنوں میں قرآن حکیم نے خدا کو ظاہر بھی کہا ہے اور باطن بھی۔ قرآن کی آیت يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ میں لفظ غیب میں خدا کو شامل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ خدا ہم سے کلیتاً مخفی ہے بلکہ فقط یہ ہے کہ ظاہر اور آشکار ہونے کے باوجود اس کی ذات ہماری آنکھوں سے نہاں ہے۔ خدا مظاہر قدرت میں اپنی صفات کی آشکارائی کی وجہ سے آشکار ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ مظاہر قدرت خدا کی آیات یا خدا کے نشانات ہیں اور خدا کو جاننے کے لیے ان کا مشاہدہ اور مطالعہ کرو، کچھ مظاہر قدرت کا ذکر کرنے کے بعد قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار! تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو) یہ اشارہ صرف ایک ایسی ہستی کی طرف ہی کیا جا سکتا ہے جو صاف طور پر سامنے نظر آ رہی ہو۔ اسلام میں مشاہدہ و مطالعہ قدرت ایمان باللہ کے لئے ضروری ہے۔ مغرب کی موجودہ عیسائیت میں مشاہدہ و مطالعہ قدرت ایمان باللہ کے منافی یا کم از کم اس سے بے تعلق ہے۔ لہٰذا جس طرح سے فلسفہ مغرب میں نامشہود (UNSEEN) اور فوق الفطرت (SUPER NATURAL) کے الفاظ خدا کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں اسلام میں- جو فلسفہ زندگی ہے- استعمال نہیں کیے جا سکتے اگر فلسفہ مغرب کے قائلین نے علوم جدیدہ سے خدا کے عقیدہ کو الگ کر دیا ہے تو ہمارے لئے ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور پھر خودی کی فطرت اس بات کی گواہ ہے کہ انسان آرزوئے حسن کے سوائے اور کچھ نہیں اور انسان کی یہ آرزوئے حسن خدا کے سوائے اور کسی نصب العین سے مطمئن نہیں ہوتی۔ اگر خدا کی جستجو کو نادانی سمجھا جائے تو انسان اپنی اس ایک ہی آرزو کی تشفی کیسے کرے گا جس پر اس کی پوری فطرت مشتمل ہے۔ انسان کو عقل ہی کی کمی نہیں بلکہ جنون یعنی خدا کی محبت کی بھی ضرورت ہے۔ اگر وہ عقل کل ہو جائے تو پھر بھی خدا کی محبت کے جنون سے بے نیاز اور بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ سچے خدا سے بے نیاز ہو گا تو اسے زندہ رہنے کے لئے کسی جھوٹے اور ناحقدار خدا کی محبت اور اطاعت کا پھندا اپنے گلے میں ڈالنا پڑے گا۔ لہٰذا اقبال فلسفہ مغرب کے قائلین پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش

محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی | اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جسکا نام وہ ہے اک جنوں خام | ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش
کہتا ہے مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور | مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش
با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است | ہر چند عقل کل شدہ رای بے جنوں مباش

## سائنس محبت کی خانہ زاد ہے

اوپر ہم نے دیکھا ہے کہ اقبال کا خیال یہ ہے کہ نصب العین کی محبت انسان کے تمام اعمال کو پیدا کرتی ہے اوران کو اپنی غرض کے لئے کام میں لاتی ہے۔ ہمارا نصب العین ہی ہمارے لئے درست و نادرست صحیح اور غلط، نیک اور بد اور زشت و زیبا میں فرق پیدا کرتا ہے۔ مشاہدہ قدرت اوراس سے نتائج اخذ کرنے کا عمل جس سے سائنس کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ خواہ ہمارا نصب العین صحیح ہو یا غلط، کامل ہو یا ناقص ہر حالت میں ہمارے مشاہدات کے نتائج ہمارے نصب العین کی روشنی میں ہی مرتب ہوتے ہیں اوراس کے تائیدی اور تشریحی حقائق کے طور پر بروقت ضرورت کام آنے کے لئے ہمارے پاس محفوظ رہتے ہیں اگر ہمارا نصب العین غلط اور ناقص ہوگا تو ہمیں قدرت ایک خاص رنگ میں دکھائی دے گی۔ جو اس نصب العین کا رنگ ہوگا اور ہمارے سائنسی مشاہدات اور سائنسی نتائج ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل ہوں گے جو اس نصب العین کے مطابق ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ہم قدرت کے مشاہدہ سے صحیح نتائج اخذ نہ کرسکیں گے اور وہ اسی نسبت سے غلط ہوں گے جس نسبت سے ہمارا نصب العین غلط ہوگا اور ہمارا نصب العین صحیح ہوگا تو ہم قدرت کا مشاہدہ اس حقیقت کی روشنی میں کریں گے کہ قدرت خدا کی تخلیق اور خدا کے حسن کا مظہر ہے۔ پھر قدرت بھی اور طرح سے نظر آئے گی اور اس کے مشاہدہ سے ہمارے نتائج بھی اور طرح سے مرتب ہوں گے۔

؎ کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

اگر سائنس خدا کے تصور پر قائم ہو تو جوں جوں وہ ترقی کرتی ہے اپنے غلط نتائج کو خود بخود درست کرتی چلی جاتی ہے۔ بے خدا سائنس میں یہ خاصیت نہیں ہوتی کیونکہ وہ حقیقت الحقائق یعنی خدا کے تصور کی روشنی اور راہ نمائی سے محروم ہوتی ہے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ براہیم      کیا ہے جس کو خدا نے دل ونظر کا ندیم
وہ علم بے بصری جس میں ہمکنار نہیں      تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

خدا کے عقیدہ کی روشنی میں کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے سے جو سائنس تعمیر ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اغلاط سے پاک ہوتی ہے اور علم رنگ و بود کی صحیح تشریح اور تفسیر ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ہمارے ذوق حسن (دیدہ) کی پرورش اور ہماری محبت (دل) کی تربیت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ہمیں جذب وشوق یعنی معرفت حق تعالیٰ کی انتہائی منزلوں تک پہنچا دیتی ہے اور خود جبرائیل کی طرح خدا کا راز دار بنا دیتی ہے۔

علمِ تفسیر جہانِ رنگ و بو      دیدہ و دل پرورش گیرد ازو
برمقامِ جذب وشوق آرد ترا      باز چوں جبریلؑ بگذارد ترا!

اقبال کے اس خط کے مطابق جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے لفظ ''علم'' سے یہاں اقبال کی مراد پھر سائنس ہے۔ اقبال نے سائنسی تحقیق وتعلیم پر بڑا زور دیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس کا یہ خیال ہے کہ سائنس کے ذریعہ سے مسلمان نظام عالم کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے جدوجہد کر کے اپنی ممکنات کو آشکار کر سکتا ہے اور اپنی قوتوں کو توسیع کر سکتا ہے اور ہر لحاظ سے طاقتور ہو کر اپنے مقصد زندگی یعنی کلمہ توحید کی نشر واشاعت کو زیادہ آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ کائنات پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ مومن کی خودی اس کی تسخیر کر کے ترقی پائے اور اپنے کمال کو پہنچے۔

ماسوا از بہر تسخیر است وبس      سینہ او عرضہ تیر است وبس
از کن حق ما سوا شد آشکار      تا شود پیکان تو سنداں گداز

☆☆☆

خیز و وا کن دیدہ مخمور را      دون مخوان ایں عالم مجبور را
غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است      امتحانِ ممکناتِ مسلم است
جستجو را محکم از تدبیر کن      انفس و آفاق را تسخیر کن
تو کہ مقصودِ خطابِ انظری      پس چرا ایں راہ چوں کوران بری
چوں صبا بر صورتِ گلہا متن      غوطہ اندر معنیٔ گلزار زن

آنکہ براشیا کمند انداخت است　　مرکب از برق وحرارت ساخت است

علم اسماء اعتبارِ آدم است　　حکمت اشیاء حصار آدم است

## مظاہر قدرت کے علم کی اہمیت

یہ جہان رنگ و بو کوئی راز نہیں بلکہ اس کی آفرینش کی غرض و غایت آشکار ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اسے مسخر کر کے خدا کے ایک سپاہی یا خادم کی حیثیت سے اپنی قوتوں میں اضافہ کرے اور خدا کی صفاتِ حسن و کمال کو آشکار کرے۔ گویا کائنات ایک ساز ہے جس سے ایک دلکش نغمہ پیدا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کے تاروں کو جنبش دینے والا مرد مومن ہو؛ ذرا مرد مومن اس کے تاروں کو ہلا کر تو دیکھے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

جہان رنگ و بو بیدا تو مے گوئی کہ راز است ایں

یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است ایں

قرآن حکیم نے مظاہر قدرت کو آیات اللہ یا خدا کے نشانات اس لئے قرار دیا ہے کہ ان میں خدا کی صفات کا جلوہ اور اس کی قدرتوں اور حکمتوں کا نور روشن ہے؛ لہٰذا اشیاء کے خواص و اوصاف یا سائنسی حقائق خدا کے اسرار میں سے ہیں۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ O

''بے شک آسمانوں اور زمین کے اندر جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں''

لہٰذا جو شخص خدا کی آیات کا مشاہدہ اور مطالعہ خدا کی آیات سمجھ کر کرتا ہے وہ مؤمن ہے۔ سائنس کی بنیاد ہی خدا کا یہ حکم ہے کہ نظام فطرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کرو۔ قرآن میں ہے:

اُنۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ

''جو کچھ زمین اور آسمان میں پیدا کیا گیا ہے اسے دیکھو''

اقبال لکھتا ہے:

ہر چہ مے بینی ز انوار حق است　　حکمت اشیاء ز اسرار حق است

ہر کہ آیات خدا بیند حر است　　اصل ایں حکمت زحکم انظر است

بندہ مؤمن پر حکمت اشیاء یا سائنس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی حالت دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے بہتر ہو جاتی ہے اور خدا کی محبت اور معرفت کے ترقی پا جانے سے دوسرے انسانوں کے لئے اس کی محبت اور ہمدردی اور دلسوزی بڑھ جاتی ہے۔ جب خدا کی تخلیق کا علم اس کے آب وگل کو روشن کرتا ہے تو اس کا دل خدا سے اور زیادہ ڈرنے لگتا ہے۔

بندۂ مؤمن ازو بہروز تر　　ہم بہ حالِ دیگراں دل سوز تر
علم چوں روشن کند آب وگلش　　از خدا ترسندہ تر گردد دلش

ظاہر ہے کہ ایسی سائنس ہماری خاک کے لئے کیمیا کا حکم رکھتی ہے کہ اس کو کندن بنا دیتی ہے لیکن خدا کے عقیدہ سے الگ ہو کر کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے سے جو سائنس تعمیر ہوتی ہے چونکہ وہ خوب وزشت کے صحیح معیار سے عاری ہوتی ہے اور ظلم اور انصاف کے درمیان فرق نہیں کرسکتی' اس کی تاثیر دہریت پرستی، مادیت پرستی، قومی خودغرضی، کمزور اقوام پر ظلم اور سفا کی اور ان کو غلام بنانے اور لوٹنے کی کوشش، بداخلاقی اور بے حیائی، بین الاقوامی مناقشات اور ہولناک عالمگیر لڑائیوں اور ان کے دوران میں ہیروشیما اور ناگاسا کی ایسے پر امن شہروں کی تباہی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم مغرب میں بے خدا سائنس کی اس تاثیر کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ افرنگیوں کی سائنس ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے نوع انسانی کی ہلاکت کے درپے ہے، یورپ کا گرا ہوا قانون اخلاق اور اس کی بے خدا سائنس افسوسناک ہیں۔ عقل جب خدا کی محبت کے تابع رہے تو ایک بلند پایہ روحانی فعلیت ہوتی ہے اور جب خدا کی محبت سے آزاد ہو جائے تو شیطنت بن جاتی ہے۔ مسلمان جو روح اور جسم کی ضرورتوں میں امتیاز کرسکتا ہے اس کا فرض ہے کہ مغرب کی اس بے خدا تہذیب کے طلسم کو توڑ ڈالے۔

علم اشیا خاکِ ما را کیمیاست　　آہ! در افرنگ تاثیرش جداست
عقل وفکرش بے عیارِ خوب وزشت　　چشم او بے نم' دل او سنگ وخشت
دانشِ افرنگیاں تیغے بدوش　　در ہلاک نوعِ انسان سخت کوش
آہ از افرنگ واز آئینِ او　　آہ از اندیشۂ لادینِ او

اے کہ جان را بازمی دانی زتن　　سحر ایں تہذیب لادینے شکن

عقل اندر حکم دل یزدانی است　　چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

اہل مغرب نے مادی علوم میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ اب وہ ماہ و پروین پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔اور وہ وقت بھی آپہنچا ہے جب انسان چاند کی سطح پر نازل ہو گیا ہے لیکن جب تک انسان کی یہ ترقی یافتہ عقل خدا کی محبت کے ولولہ کے ساتھ شریک نہیں بنتی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار

شریک شوزش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

## صحرانشینوں کی دانہ کاری

سائنس فرنگیوں کے گھر پیدا نہیں ہوئی اس کی اصل کائنات کے متعلق نئے نئے حقائق کو دریافت کرنے کا ذوق ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ہے ۔جو شخص بھی مشاہدہ اور مطالعہ قدرت سے اس ذوق کی تشفی کا اہتمام کرے گا وہی سائنس دان بن جائے گا خواہ وہ مغرب کا رہنے والا ہو یا مشرق کا۔اور تاریخ کے حقائق بتا رہے ہیں کہ سائنس تو ایجاد ہی مسلمانوں کی ہے جن کے ذوق دریافت کو قرآن نے معرفت حق تعالیٰ کے ایک ذریعہ کے طور پر اکسایا اور یہ کہہ کر اس کی راہنمائی کی کہ اس کے نتیجہ کے طور پر تمہیں خدا کا عرفان حاصل ہوگا۔لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم پھر اپنی ایجاد کے ساتھ شغف پیدا کریں لیکن اس کو خدا کے عقیدہ سے الگ رکھنے کا جرم کر کے مغرب کی لادینی تہذیب کے فروغ کا سبب نہ بنیں کیونکہ یہی لادینی تہذیب ہے جس نے مسلمانوں کے لئے بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا محال کر دیا ہے۔اس نے کئی فتنے پیدا کیے ہیں اور مسلمانوں کو خدا سے بیگانہ کر کے پھر نیشنل ازم،عرب ازم، کمیونزم اور ایسے ہی دوسرے نو تراشیدہ بتوں کی پرستش پر مائل کر دیا ہے۔گویا حرم کعبہ میں پھر لات اور عزیٰ کو لا کر کھڑا کر دیا ہے۔اس تہذیب کی بے خدا سائنس نے دلوں کی آنکھوں سے نور زائل کر دیا ہے اور روحوں کو خدا کی محبت کے آبِ حیات سے محروم کر کے تشنگی سے مار ڈالا ہے،اس نے دلوں سے خدا کی محبت کا سوز ہی رخصت نہیں کیا بلکہ کہنا چاہیے کہ خود دلوں کو ہی جن میں خدا اور انسان کی محبت رہتی ہے، پیکر ان گل سے غائب

کر دیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ دورِ حاضر کا انسان محض حیوانات کی سطح پر آ گیا ہے اور نیک و بد اور زشت و زیبا میں فرق نہیں کر سکتا۔

حکمت اشیا فرنگی زاد نیست — اصل او جز لذتِ ایجاد نیست
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست — باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست
لیکن از تہذیبِ لادینے گریز — زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز
فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد — لات و عزّیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر — روح از بے آبیٔ او تشنہ میر!
لذت بے تابی از دل می برد — بلکہ دل زیں پیکرِ گل می برد

## مقصودِ مکتب

اس دور میں مسلمانوں نے بھی اپنی تاریخ اور روایات اور قرآن کے ارشادات کو فراموش کر کے عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید میں مغرب کی بے خدا سائنس کو جسے اقبال ''اندیشہ لادین'' کہتا ہے اپنا لیا ہے اس وقت تمام عالم اسلامی میں مسلمانوں کے مدرسے اور کالج اور یونیورسٹیاں بے خدا سائنس کی درس وتدریس میں مصروف ہیں جس کی وجہ سے پورے عالم اسلامی میں نوجوان تعلیم یافتہ افراد اسلام سے دور اور دورتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال اس صورت حال پر بار بار اظہار افسوس کرتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمیں مدرسہ اور کالج میں خدا کا عقیدہ پھر اپنے مقام پر واپس لانا چاہیے۔ تعلیم کا تو مدعا ہی یہ تھا کہ خودی کو اپنی زندگی کے ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لئے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور یہ مقصد علم اور عمل کے ذریعہ سے خدا کی محبت کے جذبہ کی آزادانہ نشو ونما اور تسکین اور تشفی ہے۔ اقبال کو افسوس ہے کہ مکتب کو اپنے مقصود کا ہی علم نہیں۔ جبھی تو وہ خدا کی محبت (جذب اندروں) کی پرورش کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست
تا بجذب اندرونش راہ نیست

خدا کی محبت کی شراب (مے یقین) ہی زندگی میں سوز یا گرمیٔ عمل پیدا کر سکتی ہے۔ خدا کرے کہ توحید کا عقیدہ نظام تعلیم کی بنیاد بنے تا کہ یہ گرمی پیدا کرنے والا آگ کی طرح کا پانی مدرسہ کا بھی نصیب ہو۔

مے یقین سے ضمیر حیات ہے پر سوز
نصیب مدرسہ یارب یہ آب آتشناک

دور حاضر کے مکتب کا بے خدا نظام تعلیم طالب علم کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ عمر بھر خدا کا نام لے سکے۔ یہ ایسا ہے جیسے کہ کسی کا گلا گھونٹ دیا جائے کہ پھر اس سے لا الٰہ الا اللہ کی صدا نہ نکل سکے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لاالٰہ الااللہ

مغربی نظام تعلیم جو اب مشرق میں بھی رائج ہے اس اصول پر مبنی ہے کہ طالب علم کو کسی عقیدہ کی تعلیم نہیں دینی چاہیے تا کہ اس کی عقل آزاد رہے اور اس میں خود ہر بات پر غور و فکر کر کے اسے ردّ یا قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اگر استاد کی طرف سے اس پر کوئی عقیدہ ٹھونسا گیا تو پھر اس کی سوچ و بچار ایک تنگ دائرہ کے اندر مقید ہو جائے گی لیکن اس اصول پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ طالب علم کی عقل تو آزاد ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اس کے خیالات کا کوئی مرکز یا محور نہیں بنتا وہ بغیر کسی ضبط یا نظم کے رہ جاتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ طالب علم کے اندر اس عقیدہ کو پیدا کیا جاتا اور پختہ کیا جاتا جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے اور جس کے لئے اس کی فطرت پیاسی ہے یعنی خدا کا عقیدہ، ایسی حالت میں اس کے ذہن پر کوئی خارجی اور مصنوعی دباؤ نہ پڑتا بلکہ وہ اپنی فطری آزادی کو حاصل کر لیتا اور اس کو غلام بنانے والے یا اس کی فطرت سے ہٹانے والے تمام تصورات خارج از بحث ہو جاتے اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیالات کے اندر ایک ربط یا نظم بھی پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ پھر یہ عقیدہ اس کے تمام خیالات کا مرکز یا مدار بن جاتا اور وہ ان کو اپنے اس عقیدہ کی روشنی میں دیکھ سکتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغرب میں ایسے نظام تعلیم کے پیدا کیے ہوئے تعلیم یافتہ افراد کے دلوں میں خدا کی محبت مردہ ہوتی ہے اور اگر مشرق میں ایسے نظام

تعلیم کے باوجود خدا کی محبت پھر بھی زندہ رہتی ہے تو مکتب کی راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے مکتب جو خیالات اور افکار طالب علم کے ذہن میں پیدا کرتا وہ خدا کے عقیدہ کے ساتھ ملحق نہیں ہوتے اور ان میں کوئی فطری ربط نہیں ہوتا اور وہ مغرب کے گونا گوں غیر فطری عقائد کے تصرف میں آ جاتے ہیں۔ایسی حالت میں عقل مغرب کی غلامی کی وجہ سے غلط طریق پر کام کرتی ہے اور غلط سمت میں سوچتی ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اگرچہ خدا کا عقیدہ انسان کی فطرت ہے۔تاہم یہ مشت خاک انسان اس طرح سے بنا ہے کہ اگر اس کی مناسب قسم کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو وہ اپنی فطرت کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھاتا ہے اور غلط اور ناقص تصورات کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔اگر ہمارا خیال یہ ہو کہ اگر ہم طالب علم کو آزاد رہنے دیں تو اس کے دل میں خدا کی محبت خود بخود پیدا ہو جائے گی اس لئے کہ یہ اس کی فطرت ہے، تو یہ خیال درست نہیں۔خدا کے عشق کی آتش ہمہ سوز خودی کی مناسب پرورش اور تربیت کے بغیر روشن نہیں ہوتی۔صوفیاء کا قول ہے کہ خدا کی محبت ایک آگ ہے جو ماسویٰ اللہ کو جلاء دیتی ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشت خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

خدا کے عقیدہ کو کالج کے سائنسی علوم سے نکال دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنا گھر روشن دیکھنا چاہتا ہو لیکن ایک بڑی سی دیوار بنا کر سورج کی روشنی کو مسدود کر دے۔ پروفیسر ایک عمارت گر ہے اور جو عمارت وہ تعمیر کر رہا ہے وہ روحِ انسانی ہے، حکیم قاآنی نے ایک عمدہ بات کہی ہے جو پروفیسر کو مدنظر رکھنی چاہیے کہ اگر اپنے گھر کے صحن کو روشن رکھنا چاہتے ہو تو صحیح عمارت گری یہ ہے کہ سورج کے سامنے دیوار کھڑی نہ کرو۔

شیخ مکتب ہے ایک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روح انسانی

نکتہ دل پذیر تیرے لئے     کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیش خورشید برمکش دیوار     خواہی از صحن خانہ نورانی

## متاعِ دین ودانش کا زیاں

پھر بھی ہم یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہماری نئی نسلیں صحیح طور پر مسلمان ہوں۔ گویا ہم بے خدا سائنس کے روح فرسا نتائج اور اثرات سے بالکل بے خبر ہیں۔ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو بلند ترین کتابوں کے ذریعہ سے یہ بتائیں کہ علم اخلاق، علم سیاست، علم اقتصادیات، علم تعلیم، علم قانون وغیرہ میں خدا کہیں نہ آتا ہے اور نہ آسکتا ہے اور پھر یہ توقع رکھیں کہ ان نوجوانوں کی اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی سرگرمیاں باخدا ہوں گی۔ لہٰذا اقبال تنبیہ کرتا ہے کہ اس بے خدا سائنس کی تعلیم کو بے خطر نہ سمجھو۔ اس سے تمہاری پوری قوم کی روح فنا ہورہی ہے۔

مشو ایمن ازاں علمے کہ خوانی
کہ از وے روح قومے را تواں کشت

ہمارے کالجوں کی بے خدا سائنس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مغربیت اور جدیدیت کے کافر ادا معشوق کے خونریز غمزوں پر ایسے مرمٹے ہیں کہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس طرح سے ہم نے دین کی متاع کو ہی نہیں بلکہ دانش (یعنی سچی باخدا سائنس) کی متاع کو بھی لٹا دیا ہے۔ حالانکہ اللہ والوں کی حیثیت سے دین اور دانش کی دونوں نعمتیں ہمارے لئے ہی مخصوص تھیں۔

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزہ خونریز ہے ساقی

غیروں کی تربیت دی ہوئی اور غیروں کے نظریۂ کائنات میں رنگی ہوئی بے خدا سائنس کا پڑھنا اور پڑھانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے منہ کو غیروں کے تیار کیے ہوئے غازہ کے استعمال سے خوبصورت بنانے کی کوشش کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی قدر و قیمت کو دوسروں کے شعار کی نقل پر موقوف سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ہم اپنے قومی امتیازات کو بالکل کھو چکے ہیں، ہماری عقل دوسروں کے خیالات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور خود آزادی سے کچھ نہیں سوچ سکتی، ہماری ذہنی اور

ثقافتی زندگی کا ہر سانس دوسروں کا محتاج ہو گیا ہے، ہماری زبانوں پر ایسی گفتگو ہے جو دوسروں سے مانگی ہوئی ہوتی ہے اور ہمارے دلوں میں ایسی آرزوئیں ہیں جو دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں۔ اقبال اس صورت حال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے:

علمِ غیر آموختی اندوختی　　روے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش می بری　　من ندانم تو توئی یا دیگری
عقل تو زنجیریٔ افکارِ غیر　　در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار　　در دلِ تو آرزو ہا مستعار
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے　　ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

## عالم نو کی نقشبندی

توحید کا عقیدہ جب مظاہر قدرت کے علم کے ساتھ یعنی سائنس کے طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی حقائق کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کے اندر جاذبیت اور کشش کی ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حملہ ہمارے بدترین دشمنوں کو بھی بے بس کر سکتا ہے یہ قوت ایک ایسا آلہ حرب و ضرب بن جاتی ہے جس کا مقابلہ دور حاضر کے بہترین سامان حرب سے بھی ممکن نہیں ہو سکتا کیونکہ اس وقت کا حملہ دشمنوں کے دلوں کو مسخر کر کے ان کو دوست بنا دیتا ہے اور پھر ان میں مقابلہ کی ہمت ہی باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ اپنا سارا سامان حرب بخوشی حملہ آوروں کے سپرد کر دیتے ہیں گویا اگر عقیدہ توحید سائنس کے ساتھ مل جائے تو وہ ایک ایسا سامان جنگ بن جاتا ہے جس سے ہم دوسروں کو تیغ و تفنگ کے بغیر مغلوب کر سکتے ہیں۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے

یہی وجہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ سائنس کو عقیدہ توحید کے ساتھ ملحق کر کے ایک پر امن عالمگیر انقلاب پیدا کریں۔ اہل مغرب کے لئے سائنس (زیرکی) زندگی کا سامان ہے، اہل مشرق کے لئے خدا کی محبت کائنات کا راز ہے، سائنس خدا کی محبت کے ساتھ مل کر حق شناس بن جاتی ہے۔ ورنہ وہ غلطیاں کرتی اور ٹھوکریں کھاتی رہتی ہیں۔ دوسری طرف سے دنیا

میں خدا کی محبت کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا کام یعنی نشر واشاعت کلمہ توحید جس میں خدا کا سچا عاشق لگا رہتا ہے' سائنس کی مدد سے پختہ بنیادوں پر قائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جب خدا کی محبت اور سائنس ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے تو ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہمت کر کے اٹھے اور سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ بہم کر کے ایک نیا عالمگیر انقلاب پیدا کرے۔

غربیاں رازیری کی سازِ حیات — شرقیاں راعشق راز کائنات
زیرکی ازعشق گردد حق شناس — کارِعشق اززیرکی محکم اساس
عشق چوں بازیرکی ہمبر بود — نقشبندِ عالم دیگر شود
خیز ونقش عالم دیگر بنہ — عشق را بازیرکی آمیزدہ

قرآن حکیم میں کئی آیات ایسی ہیں جن میں اسلام کے آخری عالمگیر غلبہ کی زوردار پیشگوئیاں کی گئی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا غلبہ ہونا ہے تو اس کا ذریعہ خود مسلمان قوم ہی بنے گی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

''بے شک خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے حالات کو نہ بدلیں''

## بے خدا سائنس کی مخالفت

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ اب مغرب کا فکر بھی بے خدا سائنس کے خلاف ردعمل کر رہا ہے۔ پٹی رمی سوروکن (PITIRIM SOROKIN) جو ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کا پروفیسر رہا ہے۔ اپنی کتاب ''ہمارے دور کا بحران''(THE CRISIS OF OUR AGE) میں لکھتا ہے:

> ''مذہب اور سائنس کی موجودہ مناقشت خطرناک ہی نہیں غیر ضروری بھی ہے۔ اگر حقیقت کے صحیح اور مکمل نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر وہ دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں اور وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفات کو عملی دنیا میں بے نقاب کیا جائے تا کہ انسان کی شرافت اور خدا کی عظمت دونوں آشکار ہوں۔''

اسی طرح سے فیلڈ مارشل سمٹس (FIELD-MARSHALL SMUTS) جو فلسفہ کی ایک نہایت ہی عمدہ اور اونچی کتاب ''کلیت'' (HOLIM) کا مصنف ہے، لکھتا ہے:

''سچائی کی بے لوث جستجو میں اور نظم اور حسن کے مشاہدہ کے ذوق اعتبار سے سائنس آرٹ اور مذہب کے بعض اوصاف وخواص سے حصہ لیتی ہے۔ یہ کہنا قرین انصاف ہوگا کہ شاید سائنس دور حاضر کے لئے خدا کی ہستی کا واضح ترین انکشاف ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مستقبل میں نوع انسانی جو بڑے بڑے کام انجام دے گی ان میں ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ ملحق کرے گی اور اس طرح سے اس بڑے خطرہ کو دور کرے گی جو اس وقت ہمارے مستقبل کو درپیش ہے''۔

لیکن حقیقت کا صحیح اور مکمل نظریہ جس کی روشنی میں سوروکن کے خیال میں مذہب اور سائنس ایک نظر آتے ہیں فقط مسلمان قوم کے پاس ہے۔ کیونکہ خدا کا اسلامی تصور خالص اور شرک کی تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ دنیا میں اسلام کے سوائے کوئی اور مذہب ایسا نہیں جو خدا کے تصور کی پاکیزگی پر اتنا زور دیتا ہو۔ پھر خدا کے اسلامی تصور میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مظاہر قدرت جن کا مشاہدہ اور مطالعہ سائنس دان کا کام ہے، خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں اور خدا کی صفات ان کے اندر آشکار ہیں۔ مظاہر قدرت کا علم جسے سائنس کہتے ہیں خدا کے اسلامی تصور سے الگ نہیں ہوسکتا۔ یہ حقائق اس بات پر دلالت کررہے ہیں کہ خدا اور خدا کے تصور سے پیدا ہونے والی اخلاقی اقدار کو سائنس کے ساتھ ملحق کرنے کا عظیم الشان کام جو فیلڈ مارشل سمٹس کے خیال کے مطابق نوع انسانی آئندہ انجام دینے والی ہے، صرف مسلمانوں کے ہاتھ سے ہی انجام پاسکتا ہے۔

## نقش ناتمام

اگر ہم مسلمانوں کے دینی، علمی، اخلاقی اور سیاسی انحطاط کے اسباب کا تجزیہ کریں تو ان میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بنیادی سبب یہی نکلے گا کہ انہوں نے اپنی تعلیم کے لئے بے خدا سائنس کو اپنا لیا ہے۔ لہٰذا اس سبب کے ازالہ سے ان کا انحطاط زائل ہوسکتا ہے اور قرآن کی پیشگوئیوں کے مطابق ان کے عالمگیر غلبہ کے لئے راستہ ہموار ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ مسلمان قوم کا یہ رول مقدر ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں میں سائنسی علوم کی نصابی کتابوں میں خدا اور سائنس کا الحاق کر کے اپنے دینی جذبہ کے احیاء اور عقیدہ توحید کی نشر و اشاعت کا سامان پیدا کریں گے۔ دراصل ہمارے نظریہ حیات کی ممکنات کے اندر ہی اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ہم مستقبل کے اس عالمگیر انقلاب کا باعث بنیں گے جس کی تمنا اقبال نے کی ہے۔ تاہم جب تک کہ نوع انسانی سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ ملحق نہیں کرے گی اس وقت تک وہ اپنے کمال کی جانب جو اس کی منزل مقصود ہے قدم نہ اٹھا سکے گی اور نقاش ازل کا نقش یعنی انسان جس کی تکمیل کے لئے اسے یہ ہنگامہ عالم برپا کیا ہے نامکمل رہے گا کیونکہ عقل اور عشق دونوں مل کر ہی انسان کی تکمیل کر سکتے ہیں جب دونوں مل جائیں گے تو نہ عقل بے زمام رہے گی اور نہ عشق اپنے مقام سے محروم رہے گا اور جب تک دونوں الگ الگ رہیں گے اس وقت تک نہ عقل اپنا صحیح راستہ پا سکے گی اور نہ ہی عشق اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے گا۔

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

مجاہد کبیر، شیخ القرآن والحدیث، اسیر مالٹا

# حضرت شیخ الہند محمود حسن رحمہ اللہ

1850ء۔۔1920ء

انجینئر مختار فاروقی

## ذاتی حالات وکوائف

آپ کا زمانہ سیاسی افراتفری، جہادِ آزادی کی پکڑ دھکڑ اور بے شمار پھانسیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کی صف اول کی تمام لیڈرشپ کے مارے جانے کے سبب برطانوی ہند میں ہیبت ناک خاموشی اور برطانوی استعمار کے جبروتشدد کے عروج کا زمانہ ہے۔

1857ء میں ملکہ وکٹوریہ اور تاج برطانیہ کے براہ راست کنٹرول میں آجانے کے بعد پچاس سال تک مسلمانوں میں کوئی مزاحمتی تحریک نہیں اُٹھ سکی مخلص مسلمان بھی بہت ہی مدھم انداز میں اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور جذبہ جہاد اور دینی شعائر کو سینے سے لگا کر ان کو اگلی نسل کو منتقل کرنے میں ہی مصروف رہے اور یہی اس دور کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں اس تاریک اور طویل ترین نصف صدی میں امت مسلمہ کے بہت سے دردمند افراد کے دلوں میں وہ دبی ہوئی چنگاری تھی جو ''زندہ'' رہی (اور یہی اس دور کا حاصل ہے) جس نے بعد میں شیخ الہند محمود حسن، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کا روپ دھارا ہے۔

---

1857ء کے جہاد آزادی کے بعد امت مسلمہ زیرعتاب آ گئی جبکہ ہندو، مسلم دشمنی میں انگریز کی گود میں جا کر بیٹھ گیا اور مراعات لے کر خوش ہو گیا۔ مسلمان برطانوی استعمار اور ایسٹ

انڈیا کمپنی کے قزاقوں کے ایک صدی سے زخم خوردہ تھے اور ہندو اس عرصے میں بھی تجارت میں انگریز کے ساتھ تعاون کر کے معاشی فوائد سمیٹتا رہا اور انگریزی سرکار کے تعلیمی اور فلسفیانہ افکار کو قبول کر کے انگریز کا دست راست بن گیا۔

مسلمانوں میں انیسویں صدی کے اوائل میں تحریک شہیدین اُٹھی تھی اور جہاد کا جذبہ پیدا ہوا تھا لاکھوں لوگ اس سے وابستہ ہوئے اور ساتھ دیا اگرچہ یہ تحریک سکھوں سے خلاف جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر ایک معرکہ میں شکست کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی۔

اس دور میں مسلمانوں میں ایک طرف تحریک شہیدین کے جذبہ جہاد کی باقیات تھیں جنہیں جہاد آزادی 1857ء میں بھی

ے نالہ ہے بلبل شوریدہ تیرا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کے مصداق پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی تاہم وہ جذبہ ع ''آگ دبی ہوئی سمجھ، آگ بجھی ہوئی نہ جان''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ والی شان کے ساتھ سینوں میں موجزن تھا۔ دوسری طرف مغربی تہذیب اور سائنسی نظریات و افکار کا ایک سیلاب تھا جو صنعتی ترقی اور ایجادات کے نتیجے میں مغربی تہذیب کے چکا چوند مظاہر کی بنیاد پر دیگر اقوام کی طرح مسلمان امت کو بھی گھائل کیے جا رہا تھا۔ اس درد کو محسوس کر کے سر سید احمد خان اور ان کے ہم خیال لوگ اُٹھے اور انہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول، سائنسی ایجادات کے استعمال اور مغربی افکار و نظریات کو پڑھ کر ''خُذْ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدَرَ'' (صحیح لے لو اور غلط کو رد کر دو) کی راہ دکھلائی۔

مسلمان امت کے اندر دردمندی کے جذبات کے حامل سوچ کے یہ دونوں دھارے اسی عرصے میں پیدا ہوئے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں بعد بھی پیدا ہوتا چلا گیا اور مخالفت و محاذ آرائی میں شدت کا عنصر بھی آ گیا۔

دہلی مغلوں کے عہد سے ہی دارالحکومت تھا۔ برطانوی سامراج نے بھی کلکتہ کے بعد دہلی ہی کو 'مستقر' اور دارالحکومت بنایا، صدیوں سے مسلمانوں کے علمی، تہذیبی اور فکری مراکز اسی علاقے میں تھے۔ دہلی سے شمال کی طرف جانے والی ریلوے لائن پر علی گڑھ اور دیوبند واقع ہیں۔

سید مملوک علی ایک عالم تھے ان کے شاگرد سر سید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ اس عرصے میں مسلمانوں کے درمیان فکر کے دو چشمے یہیں سے پھوٹے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ فکری سرچشمے ایک دوسرے سے دور ہی نہیں ہوئے مدمقابل بھی آ گئے اگر چہ اندر سے جذبہ اور جوہر ایک ہی تھا امت مسلمہ کی زبوں حالی کا علاج اور اس سے نکلنے کے لئے جدوجہد۔

سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو 1860ء کے بعد انگریزی تعلیم سے روشناس کرانے کا بیڑا اُٹھایا۔ انگریزوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے تھے مسلمان ان کے قریب نہیں جاتے تھے 1861ء میں گورنمنٹ کالج لاہور بنا تو ایک چھوٹی سی کرائے کی جگہ پر آغاز ہوا۔ چودہ طالب علم داخل ہوئے جن میں سے صرف ایک مسلمان تھا۔ لہٰذا سر سید احمد خان نے علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی قائم کی اور 1867ء میں پرائمری سکول سے آغاز کیا۔ تاکہ مسلمان، مسلمانوں کے بنائے ہوئے مدارس میں ہی داخلہ لیں اور آگے بڑھیں۔ اسی سلسلہ نے ترقی کی ہے، یہی مدرسہ ہائی سکول اور کالج بنا اور پورے برطانوی ہند سے مسلمان نوجوانوں کی واحد مادر علمی قرار پایا، بعد میں یہی کالج 1920ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کا درجہ پا گیا۔

دوسری طرف 1867ء ہی میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو انار والی مسجد کے صحن میں ایک درخت کے نیچے تعلیم کا آغاز کر کے نصف صدی میں عالم اسلام کی سب سے بڑی درسگاہ اور جامعہ ازہر (مصر) کے پائے کا دارالعلوم (یونیورسٹی) بن گیا۔

دارالعلوم دیوبند کے پہلے شاگرد 'محمود حسن' تھے جو بعد میں مدرسے کی توسیع و ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھے پہلے مدرس اور پھر پہلے شیخ الحدیث بھی بنے اس دارالعلوم سے لاکھوں تشنگانِ علم نے اپنی پیاس بجھائی اور اقصائے عالم میں اپنے علمی و فکری اور عملی کارناموں سے امت مسلمہ کا نام روشن کیا تاہم اس مادر علمی نے شیخ الہند سے بڑا سپوت آج تک پیدا نہیں کیا تحریک شہیدین کے وارثوں کا خلوص و اخلاص تھا اور امت مسلمہ کی زبوں حالی اور برطانوی استعمار کی جبری غلامی (مُلْکًا جَبرِیًّا) سے آزادی کا جذبہ تھا جو جبر و استبداد کے باوجود سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور مختلف شکلوں میں نمودار ہو کر اپنے جوہر دکھاتا رہا تا آنکہ 1947ء میں مسلمانانِ ہند کو آزادی حاصل ہو گئی۔

دنیا بھر میں قیادت کا منبع اور سرچشمہ تین طرح کے طبقات کے ہاتھوں میں رہا ہے۔

سیاسی وعسکری قیادت حکمرانوں نے پاس، مذہبی قیادت مذہبی علماء اور مفکرین و مصلحین کے پاس جبکہ روحانی قیادت مذہبی طبقہ ہی کے درویشوں و مخلصین کے پاس۔ یہ اصول اتنا تاریخی تسلسل رکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے دور صحابہ رضی اللہ عنہم یعنی خلافت راشدہ میں قوت وسیادت کے یہ تینوں سرچشمے ایک ہی شخصیت میں جمع ہوتے تھے۔صوفیاء وعلماء یعنی مذہبی لوگ اور حکمران یعنی سیاسی وعسکری قیادت الگ الگ نہیں تھے، بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ دور صحابہ تک مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں تھے۔ مذہبی لوگ ہی سیاسی ہوتے تھے اور سیاست بھی مذہب سے علیحدہ نہیں تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں دشمنوں کی گواہی موجود ہے کہ

هم رهبان بالليل و فرسان بالنهار

**وہ رات کے راہب اور دن کے شاہسوار ہیں**

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک طرف 'اشداء علی الکفار' اور 'رحماء بینھم' ہیں ـــــــــــــــ تو دوسری طرف تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ و رضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ۔ایسی ہی جامع شخصیات تھیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور تراشیدہ 'کردار' تھے جو صدیقیت اور شہادت کے مقامات عالیہ کی زینت تھے اور ان اعلیٰ مقامات کے کامل ترین مصداق

> مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰۃِ وَ مَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ
>
> ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے حق میں تو سخت ہیں اور آپس میں رحم دل۔ (اے دیکھنے والے) تو ان کو دیکھتا ہے کہ (اللہ کے آگے) جھکے ہوئے سر بسجود ہیں اور اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں، (کثرت اور طوالت) سجود کے اثرات ان کے چہروں سے عیاں ہیں ان کے یہی اوصاف تورات میں ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں''

ایسے ہی لوگ قرآن پاک کی اصطلاح میں ''حزب اللہ'' کہلاتے ہیں اور یہ بات ثابت کرنے کی

ضرورت نہیں اظہر من الشّمس ہے کہ حزب اللہ دو چار آدمیوں کو نہیں کہتے بلکہ فئة قليلة بھی ہو تو سینکڑوں ہزاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ بدر میں یہ جماعت 313 کی تعداد میں تھی احد میں 700 کی تعداد میں اور صلح حدیبیہ کے موقع پر 1400 اصحاب رسول ﷺ اسی شان سے محمد ﷺ کی جلو میں تھے اور فتح مکہ کے سفر میں یہ جماعت یا 'حزب اللہ' 10 ہزار فرشتہ صفت انسانوں پر مشتمل تھی۔ اعلیٰ ترین ایمان کے ساتھ اتنے زیادہ پاکیزہ صفت لوگوں کا اجتماع ــــــــــــــ ایک پیغمبر علیہ السلام کے ہم رکاب راہِ جہاد میں سر بکف رواں دواں کبھی چشم فلک نے نہ پہلے دیکھا نہ بعد میں دیکھے گی۔ اسی طرح کی حزب اللہ کے پروان چڑھنے سے 'حزب الشیطان' کو ہزیمت اُٹھانی پڑتی ہے اور شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ابلیسی ایوانوں میں سوگ برپا رہتا ہے۔

---

خلافت راشدہ کے بعد آہستہ آہستہ مسلمانوں میں بھی دور بنو امیہ کے آخر تک سیاسی قیادت اور علماء الگ الگ گروہ بن گئے تھے دور بنو عباس کے آغاز کے بعد تو یہ تقسیم واضح ہو گئی بلکہ ــــــــــــ علماء اور اہل علم کے بھی دو واضح طبقات ہو گئے ایک پڑھنے لکھنے کا کام کرنے والے، تصنیف و تالیف مکاتب و مدارس سے وابستہ حضرات فقہاء اور سرکاری ملازم اور دوسرے صوفیاء جو دنیاوی عیش اور اسباب دنیا سے کنارہ کش رہ کر اللہ سے 'لو' لگانے کو اہمیت دیتے تھے یعنی صوفیاء و 'درویش'۔

یہ تینوں طبقات علیحدہ ہو کر بھی صحیح رہیں اور دین پر کاربند رہیں تو غنیمت ہے مگر جب سیاسی قیادت دین سے ہٹ جائے علماء حقانی کے ساتھ ساتھ علماء سُوء پیدا ہو جائیں اور صوفیاء ربانیین کے جلو میں دنیادار صوفی کثرت سے پیدا ہو جائیں تو اجتماعیت کا زوال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ایک تابعی حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ کا یہ شعر اسی صورت حال کا عکاس ہے۔

ے و ما افسد الدين الا الملوك

و احبار سوءٍ و رهبانها

''بادشاہوں، علمائے سوء اور درویشوں ہی نے دین میں ہمیشہ بگاڑ پیدا کیا ہے''

جنوبی ہند میں مغلیہ دور میں بھی یہی صورت حال تھی حضرت اورنگ زیب رحمہ اللہ کے

دور میں سیاسی قیادت، مذہبی قیادت اور صوفیاء میں مخلص حضرات کی کثرت تھی مگر اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ بگاڑ میں اضافہ ہوتا چلا گیا پہلے سیاسی قیادت پر زوال طاری ہو گیا ــــــــــــ جب اصلاح کی کوئی صورت نہ رہی تو مسلمانوں کی قیادت علماء مخلصین کے ہاتھ میں آ گئی چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا خاندان 1750ء کے بعد سے امت مسلمہ کی 'اُمیدوں' کا مرکز بنا رہا۔ انگریزوں کی آمد اور بنگال و میسور میں مسلمانوں کی سیاسی پسپائی کے بعد یہ علماء کا ہی طبقہ تھا جس نے مسلمانوں کو جذبہ اور تحفظ فراہم کیا ہے۔

خاندان شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ہی نے سب سے پہلے جہاد کا فتویٰ دیا اور اس خاندان کے تربیت یافتہ لوگ تھے جنہوں نے جہاد کا علم بلند کیا اور تحریک شہیدین برپا کر کے مسلمانوں کے سامنے قرنِ اوّل کی یاد تازہ کر دی۔ اس جہادِ آزادی میں بھی مسلمانوں کی قیادت تحریک شہیدین کی باقیات صالحات کے علاوہ مولانا فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ نے کی تھی اور کالے پانی کی عمر قید کی سزا پائی۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز نے مسلم قیادت کو اس بے دریغ انداز میں (اور تھوک کے حساب سے) پھانسیاں دیں کہ صرف پچیس، تیس سال کی عمر کی قیادت کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو سکی اور وہ بھی زیادہ تر روپوش ہو گئی ہجرت کر گئی یا گوشہ گمنامی میں چلی گئی۔

---

آپ کی علمی قابلیت کا اندازہ اولاً آپ کی پورے برطانوی ہند میں علمی شہرت اور برتری سے اور دوسرے درجے میں آپ کے مشہور تلامذہ کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ دنیا میں یہ عام اصول تسلیم کیا جاتا ہے کہ جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح کوئی شخصیت اپنے شاگردوں سے پہچانی جا سکتی ہے۔ آپ کے علمی مقام کے پیش نظر آپ کے ہم عصر علماء و فضلاء نے آپ کو شیخ الہند کا خطاب دیا جبکہ آپ کے شاگردوں میں سے چند مشہور اصحاب علم و فضل کے نام درج ذیل ہیں:

☆ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ

☆ مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ۔ جن کے شاگردِ خاص علامہ محمد یوسف بنوریؒ تھے

جنہوں نے جامعہ بنوریہ کراچی کی بنیاد رکھی۔

☆ علامہ عبیداللہ سندھی رحمہ اللہ

☆ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ جنہوں نے دارالعلوم کراچی کی بنیاد رکھی مفتی تقی عثمانی، مفتی رفیع عثمانی وغیرہم اُن کے ابناء واحفاد ہیں۔

☆ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ۔ آپ حضرت کے سیاسی مشن کے جانشین بنے۔

☆ مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ

☆ مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ

☆ مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمہ اللہ (بانی تبلیغی جماعت)

☆ مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

حضرت محمود حسن رحمہ اللہ نے چالیس سال دیوبند میں تدریس کا کام کیا۔ آپ کے ہزاروں شاگرد تھے۔ طلباء کابل سے لے کر آسام تک سے آتے تھے اور علم کے اس سرچشمہ سے خوب خوب سیراب ہوتے تھے۔ آپ نے علم کے ساتھ ساتھ شاگردوں کی ہمہ جہتی تربیت بھی فرمائی اور ان میں جذبۂ جہاد کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔

حضرت امداداللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ (وفات 1899ء) کے بعد آپ نے جہاد حریت اور برطانوی سامراج سے ملکی آزادی کے لئے بہت کام کیا اور اندرون ملک ہی نہیں افغانستان، ترکی اور حرمین شریفین تک رابطے فرمائے۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک تحریک کا آغاز فرمایا اور اس کا جال پورے ملک اور بیرون ملک پھیلا دیا۔ اس تحریک کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے افغانستان ہجرت کی جائے اور وہاں سے والی افغانستان کی مدد سے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کا آغاز کیا جائے (یہ منصوبہ قابل عمل تھا یا نہیں یہ دوسری بات ہے) شیخ الہند نے اس منصوبے پر انتھک کام کیا۔ اس تحریک کی بدولت آپ کے کارکن پورے ہندوستان میں سرگرم تھے اور یہ منصوبہ آگے بڑھ رہا تھا اسی سلسلے میں 1916ء میں آپ حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں قیام کیا اور ارادہ تھا کہ ترکی حکومت سے رابطہ کریں اور انہیں اس منصوبہ کا قائل کریں کہ آپ کی سرگرمیوں اور ملاقاتوں کے پیش نظر شریف مکہ

کی حکومت نے گرفتار کر کے آپ کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا اور انگریز نے آپ کو بحیرۂ روم کے قدیم عیسائی مرکز جزیرہ مالٹا میں چار سال کے لئے قید کر دیا اور رہائی اس وقت ملی جب ڈاکٹر نے ٹی بی کی تشخیص کر دی (ٹی بی اس وقت تک قابل علاج مرض نہیں تھا) آپ چار سال کی قید کاٹ کر جون 1920ء میں ممبئی کے ساحل پر اُترے تو استقبال کرنے والوں میں آپ کے عقیدت مندوں اور شاگردوں کے علاوہ چوٹی کے سیاسی لیڈر مہاتما گاندھی بھی موجود تھے۔ قید و بند کی اس صعوبت میں آپ کے شاگرد (حضرت) حسین احمد مدنی (رحمہ اللہ) مدینہ سے ہی آپ کے ساتھ ہو گئے تھے اور انہوں نے آپ کے ساتھ خدمت کے جذبے اور حق شاگردی کی ادائیگی کے لئے رضا کارانہ جیل کاٹی اور استاد کی خوب خوب خدمت کی۔ حضرت شیخ کی عمر 1916ء میں 66 سال کی تھی۔

---

یہ سیاسی تحریک، جہاد حریت اور وطن کی آزادی کا پیغام آپ نے جس طرح وسائل کی کمی کے باوجود عام کیا اور حکومتی مشنری کو حیران کر کے رکھ دیا وہ آپ کے اخاذ اور اعلیٰ ذہن کی پیداوار تھی۔ یہ ملک گیر تحریک بعد میں بے نقاب ہوئی اور ریشمی رومال کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ آپ نے پیغام رسانی کے لئے ایسا طبقہ ایجاد کیا کہ برطانوی ایجنسیاں عرصہ دراز تک اس کی کھوج نہ لگا سکیں۔ یہ تحریک آپ کی وفات کے بعد ملتان میں پکڑی گئی اور اس طرح اس کی تفاصیل سامنے آنے پر کارکنوں کو ہراساں کر کے تتر بتر کر دیا گیا۔

اس تحریک کا نام 'ریشمی رومال تحریک' اس لئے پڑ گیا تھا کہ آپ کے کارکن اپنے کاندھے پر ایک ریشمی رومال رکھتے تھے (جیسے علماء کے ہاں آج کل بھی طریقہ ہے) اسی رومال کو پیغام رسانی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان رومالوں پر مختلف قسم کے پھول بوٹے اور انداز ہوتے ہیں حضرت شیخ الہند نے اسی کڑھائی (EMBROIDERY) میں تحریر کا ایک خاص انداز ایجاد کیا اور اس کو استعمال کر کے تحریک کی بنیاد بنا دیا۔

دیوبند کے اکابرین میں سے مولانا سید اصغر علی صاحب ایک معروف بزرگ اور عالم تھے ان کی اولاد تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہو کر آباد ہوئی سید رشید احمد صاحب اسلامیہ ہائی سکول جھنگ میں عرصہ دراز تک عربی ٹیچر رہے اپنے زمانہ طالب علمی 1960-1963 تک ان

سے عربی پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بعد میں سید صاحب نقل مکانی کر کے ہمارے محلّہ میں ہی آ کر آباد ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک دن ریشمی رومال تحریک کے دوران اس تحریر کی تفصیلات بتائیں تھیں۔

وہ تحریر ایسی تھی جیسے انگریزی میں بڑے حروف (CAPITAL LETTER) میں کوئی عبارت الگ الگ حروف میں لکھی جاتی ہے پہلے ایک کھڑی لکیر اردو لفظ 'الف' کی طرح لگائی جاتی تھی پھر دائیں طرف کھجور کی شاخ کی طرح لکریں لگا کر ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت ثخذ، ضظغ کے الفاظ کو ظاہر کیا جاتا تھا پھر بائیں طرف اسی طرح کی ترچھی لکیروں سے 'کلمن' لفظ میں سے اگر 'م' کو ظاہر کرنا ہے تو تین لکیریں لگا دی جاتی تھیں اس طرح سارے الفاظ لکھ کر پوری عبارت رومال پر منتقل کر دی جاتی تھی اور یہ رومال کارکن ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے رہتے تھے۔ ریشمی رومال تحریک سے وابستہ حضرات یہ کام اپنے گھر کی خواتین سے لیتے تھے گویا خواتین بھی اس تحریک آزادی میں برابر کی شریک تھیں مثال کے طور پر نام 'محمد علیؑ' کے لئے اشادات یوں لکھے جاتے ہیں:

Y Y Y Y Y Y Y

م۔ح۔م۔د ع۔ل۔ی = (محمد علی)

اسی طرح حروف ابجد کی گنتی ہے 'اعداد' کو ظاہر کرنے کے لئے ان حروف کی عددی قیمت لکھ کر رقمیں بھی لکھی جاتی تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ رواج کے طور پر آج کے رومالوں پر ابھی تک اس ڈیزائن کے نشانات بنائے جاتے ہیں اگرچہ اب ان میں کوئی معنوی حقیقت نہیں ہے۔

---

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی علمی برتری بھی مسلّم تھی۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کے درمیان دینی علم کے بے شمار مراکز اور خانقاہیں تھیں جس میں دہلی کے آس پاس کا علاقہ نمایاں تھا اس کے علاوہ بریلی، بدایوں، فرنگی محل، اجمیر شریف وغیرہ بھی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ حضرت شیخ الہند پورے ہند میں تمام مسالک کے علماء کے متفقہ سرخیل تھے۔ اس وقت پورے برطانوی ہند میں مسلمانوں کا ایک ہی مذہبی پلیٹ فارم تھا جمعیت علماء ہند اور آپ اس کے صدر تھے۔ اس

جمعیت میں علماء اہلحدیث، علماء احناف اور شیعہ مسالک کے علماء بھی جمع تھے۔ دیوبندی بریلوی علماء کی بھی تقسیم ابھی اتنی گہری نہیں تھی جتنی آج ہے۔ بریلوی علماء میں مولانا احمد رضا خان صاحب کے علاوہ سب اس جمعیت میں موجود تھے بلکہ بریلوی علماء میں بھی علمائے اجمیر شریف مولانا معین الدین اجمیری کے علاوہ مولانا احمد رضا خان صاحب کے داماد مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی بھی اس میں شامل تھے (آپ پاکستان کے مشہور عالم دین مولانا شاہ احمد نورانی کے والد اور مولانا انس نورانی کے دادا تھے)۔ یوں سیاسی اعتبار سے بھی، جہاد حریت اور آزادی وطن کی جدو جہد کے اعتبار سے بھی اور رسوخ فی العلم کے اعتبار سے بھی آپ کا مقام بہت بلند تھا۔

---

آپ نے 1916ء سے جون 1920ء تک مالٹا میں جیل کاٹی واپسی پر آپ کا ممبئ سے دیوبند تک ہر جگہ شاندار استقبال ہوا۔ دیوبند میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد ہوا جس میں آپ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی۔ اس میں آپ نے بڑے درد بھرے لہجے میں فرمایا: یہ روایت مفتی محمد شفیع صاحب دارالعلوم کراچی کی ہے جو اس جلسہ میں موجود تھے۔

”میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے: ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

(اقتباس از ''وحدت امت''، تالیف مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب)

وطن واپسی پر آپ کو جہاد حریت کے لئے کئی اقدام کرنے کا موقع ملا جن میں ایک اہم بات یہ تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو مدارس سے فارغ التحصیل تو نہ تھے مگر 1912-1914 تک اپنے جریدوں البلاغ اور الھلال کے ذریعے حکومت الٰہیہ کے قیام کی بھرپور دعوت پورے ملک میں بڑے زوردار انداز میں عام کر چکے تھے۔ آپ نے ابوالکلام آزاد کی پہلے بھی تصویب فرمائی تھی تاہم واپسی پر ان کے تبصرے اور حالات حاضرہ پر گہری نظر کی وجہ سے مسلمانوں میں نصب امام کے لئے 'امام الہند' بنانے کی کوششیں فرمائیں جو بوجوہ کامیاب نہ ہوسکیں۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ آپ نے مسلمانوں میں علی گڑھ اور دیوبند کے جدا راستوں کو مسلمانوں کی قوت کی کمزوری پر قیاس کرتے ہوئے علی گڑھ (جدید علوم کی درسگاہوں) سے رشتۂ الفت و محبت جوڑنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ آپ نے پیرانہ سالی کے باوجود علی گڑھ کا دورہ فرمایا اور وہاں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> ''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبّیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے ــــــــــ اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جار ہی ہیں' مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا''۔

(خودنوشت سوانح حیات مولانا حسین احمد مدنی، بحوالہ بیس بڑے مسلمان)

مسلمانوں کے اندر علم کے دو جدا دھارے (علی گڑھ اور دیوبند و دیگر دینی مدارس) نئ

نسل میں فکری انتشار کا باعث بن رہے تھے اور یہ خلیج وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس خلیج کو پُر کرنے یا کم کرنے کے لئے اصحاب علم و دانش نے کئی کوششیں فرمائیں جیسے ندوۃ العلماء لکھنو کا قیام وغیرہ تاہم یہ خلیج کم نہ ہو سکی۔ اسی سلسلے میں ایک کوشش حضرت شیخ الہند نے فرمائی۔ دہلی میں اپنے معتقدین اور متوسلین کے ذریعے جامعہ ملّیہ کا قیام عمل میں لائے اس ادارے نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

---

مسلمانوں کی بہتری کے لئے ایک تیسرا کام آپ نے یہ کیا ــــــــــــ جیسا کہ آپ نے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا مسلمانوں نے قرآن مجید سے دوری اختیار کر لی ہے اس کے لئے قرآن مجید کے علوم کو عوامی سطح پر لانا چاہیے اور عام کرنا چاہیے۔ یہ سوچ آپ کی پہلے سے تھی ایام اسیری میں جتنا غور فرمایا یہ سوچ اور پختہ ہوگئی۔ اسی سوچ کے تحت آپ نے قرآن کا ترجمہ کیا اور سلیس زبان میں حواشی لکھنے کا آغاز کیا جسے بعد میں آپ کے ہونہار اور لائق شاگرد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب (شیخ الاسلام پاکستان) نے مکمل فرمایا اور تفسیر عثمانی کے نام مطبوعہ موجود ہیں۔ یہ حواشی مختصر ہونے کے باوجود آج بھی نہایت مستند سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے دیباچے میں آپ نے علماء کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

> ”حضرات علمائے کرام نے عوام کی بهبودی کی غرض سے سهل اور آسان متعدد ترجمے شائع فرما دیے هیں۔ ایسے هی اس کی حاجت هے که علی العموم مسلمانوں کو ان ترجموں کو سیکهنے اور ان کے سمجهنے کی طرف رغبت بهی دلائی جائے۔ علمائے کرام اهل اسلام کو خاص طور سے ترجموں کے سیکهنے اور پڑهنے کی ضرورت اور اس کی منفعت دلنشین کرنے میں کوتاهی نه فرمائیں بلکه ترجمه کی تعلیم کے لئے ایسے سلسلے بهی قائم فرمادیں که جو چاهے اسے بر سهولت اپنی حالت کے مناسب اور فرصت کے موافق، حاصل کر سکے۔ والله الموفق و المعین“

قرآن مجید کے علوم کو عوامی سطح پر عام کرنے کی ضرورت کا احساس جتنا حضرت شیخ الہند کو 1920ء میں تھا اس سے کہیں زیادہ آج نوے سال بعد 2010ء میں بھی اس کی ضرورت ہے۔ 'عوامی درس قرآن' کا لفظ حیرت ہے حضرت شیخ الہند نے 1920ء کے لگ بھگ ارشاد فرمایا حالانکہ پاکستان میں عوام کی زبان 'عوامی' کا لفظ وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں آیا۔ کاش آج بھی اس طرف توجہ مبذول ہو اور اختلافات کو بھلا کر قرآن مجید کو حقیقتاً عام کرنے کا بیڑا اٹھایا جائے اور گلی گلی کوچے کوچے اس کو عوامی بیداری کا ذریعہ اور اساس بنایا جائے تو کچھ بعید نہیں کہ ایک طرف ہمارے درمیاں اتحاد و یگانگت پیدا ہو جائے اس لیے کہ آج بھی قرآن مجید کا متن متفق علیہ ہے اور امت کے اتحاد کا واحد ذریعہ اور اساس بن سکتا ہے اور دوسری طرف ایک شعوری انقلاب برپا ہو کر مسلمانوں کو امریکی غلامی سے نکلنے پر آمادہ کر دے۔

حضرت شیخ الہند کی ذات ستودہ صفات کی رحلت کے بعد برطانوی ہند کے مسلمانوں کی قسمت میں ایسا انقلاب آیا کہ اس کے بعد علماء دین چاہے مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور پاکستان کی جدوجہد کر کے پاکستان میں ہیں یا بھارت میں ہیں مسلمانوں کی قیادت کے منصب سے محروم ہو گئے۔ یہاں مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی کے ساتھ شامل ہو کر وزارت مذہبی امور یا امور کشمیر لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں یا اسلامی نظریاتی کونسل اور رویت ہلال کمیٹی کی صدارت حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل اقتدار کسی اور کے پاس ہوتا ہے اور چاہے بھارت کے مسلمان ہوں ان کی قیادت علماء کے ہاتھ سے نکل کر جدید تعلیم یافتہ کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور گزشتہ پوں صدی سے حالات کا رُخ یہی ہے نہ معلوم یہ صورت حال کب تک جاری رہے گی یا علماء دین جدید علوم سیکھ کر حالات حاضرہ اور ریاستی معاملات کی باریکیوں کو سمجھنے لگیں گے تو قیادت کے منصب پر فائز ہوں گے یا جدید تعلیم یافتہ حضرات علم دین سے بہرہ ور ہو کر اسلام کے تقاضوں کے مطابق خلافت قائم کر دیں گے۔

شیخ الہند کی تصنیفات کم ہیں آپ نے اپنے شاگردوں کی شکل میں سیرت و کردار کے پیکر تصنیف فرمائے جو دعوت و تبلیغ، اصلاح امت، علم و تحقیق، جہاد آزادی اور حفاظت دین کے میدان کے شہسوار بنے اور آپ کے لیے توشۂ آخرت۔

حضرت شیخ الہند نے نومبر 1920ء میں وفات پائی اور ہزاروں شاگردوں اور لاکھوں

ابنائے وطن کو سوگوار چھوڑ کر دیوبند میں مدفون ہوئے۔

ع　　　آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

یہ سیمینار 4 نومبر 2007ء بروز اتوار، صبح 9:00 بجے تا 11:00 بجے منعقد ہوا۔
اس میں معروف علماء، فضلاء، پروفیسر اور وکلاء حضرات نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ
کے حالات زندگی پر بھرپور اظہار خیال فرمایا۔

☆ سیکرٹری ملی مجلس شرعی وصدر تحریک اصلاح تعلیم، لاہور

اتحادامت کے سلسلے میں

# ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین☆

یہ چند سال پہلے کی بات ہے کہ ہم نے ایک دن شہید ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب سے کہا کہ ہمارے دینی سیاسی لوگ اکٹھے نہیں ہوتے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہاں 'کرسی' کا مسئلہ ہے لیکن دعوت و اصلاح جیسے غیر سیاسی کام میں دینی لوگ جمع نہیں ہو سکتے جبکہ اس کام کی بڑی سخت ضرورت بھی ہے۔ کہنے لگے کہ اس میں کوئی بڑی رکاوٹ بظاہر تو نظر نہیں آتی۔ چنانچہ ہم نے باہم مشورہ کر کے مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام اور سول سوسائٹی کے دیندار افراد کا ایک اجتماع جامعہ نعیمیہ میں رکھا جس کا ایجنڈا اور ورکنگ پیپر راقم نے تیار کر کے شرکاء کو بھجوا دیا۔ اس اجلاس کی دو نشستیں عصر سے عشاء تک ہوئیں۔ ایجنڈے کا اہم نکتہ دعوت و اصلاح اور فرد کی تربیت تھا لیکن افغانستان اور عراق کا مسئلہ اور پاکستان کے سیاسی حالات جیسے اجتماعی مسائل شرکاء کے ذہنوں پر چھائے رہے اور ہم کوشش کے باوجود شرکاء کو دعوت و اصلاح کی کسی اجتماعی حکمت عملی کی طرف نہ لا سکے۔

یہ بات ہمیں اس حوالے سے یاد آئی کہ ہمارے مہربان مولانا زاہد الراشدی صاحب نے اپنے جریدے ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ کے فروری 2010ء کے شمارے میں منجملہ دوسری باتوں کے پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لئے سارے مکاتب فکر کے علماء کرام پر مشتمل ایک نئی دینی جماعت کے قیام کی ضرورت کا ذکر کیا ہے جو انتخاب و اقتدار کی سیاست میں پڑے بغیر اجتماعی جدوجہد کرے۔ مولانا کی بات سرسری اور مجمل ہے اور غالباً کوئی منضبط اور تفصیلی تجویز پیش کرنا ان کے مدنظر نہیں تھا۔ ہم چونکہ اس موضوع پر سوچتے رہتے ہیں لہٰذا ہمارے ذہن میں ایک نئی

دینی تحریک کا پورا نقشہ موجود ہے جو ہم اہل فکر ونظر کے سامنے رکھ رہے ہیں تا کہ وہ اس پر غور فرمائیں اوراس کے حسن وقبح پر بحث کے نتیجے میں کوئی اچھی اور قابل عمل بات سامنے آ سکے۔

1۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنی موجودہ زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارنا ہے تا کہ ہم اُخروی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکیں اور اس کی نعمتوں کے سزاوار ٹھہریں۔ اگر ہم بحیثیت معاشرہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی زندگی گزاریں گے تو ہم ان شاءاللہ اس دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور زوال کے گڑھے سے نکل کر عزت وعظمت کی راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔ دنیا میں ہمارے زوال کا ایک بنیادی سبب ہماری اپنے نظریہ حیات (اسلام) سے دوری اور اس کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے اندر وہ صلاحتیں پنپ نہیں پا رہیں جو دنیا میں جمع اسباب اور ترقی وغلبے کی راہ ہموار کرتی ہیں۔

یہ بنیادی فکری پہلو ہم نے ابتداء ہی میں اس لئے واضح کر دیا کہ ہمارے نزدیک یہی دنیا میں مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کی اساس ہے نہ کہ اس مغربی فکر وتہذیب کی پیروی جو اپنی اساس میں غیر اسلامی ہے۔ دنیا اور آخرت میں بیک وقت کامیابی کے اسی نظریے پر نبی کریم ﷺ نے معاشرے کی بنیاد رکھی جسے آپ ؐ کے صحابہ کرام ؓ نے بھی جاری رکھا اور وہ ربع صدی کے اندر نہ صرف جزیرہ نما عرب بلکہ اس وقت کی ورلڈ پاورز پر غالب آ گئے اور ایسی خوشحالی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ مسلم معاشرے میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ رہا۔ لہٰذا آج بھی ہماری ترقی اور کامیابی کی اساس دین سے ایسی وابستگی ہے جو ہمارے دنیا کے مسائل بھی حل کر دے اور آخرت میں بھی ہماری کامیابی کے راستے کھول دے۔

2۔ اس نظریاتی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے آیئے ہم یہ دیکھیں کہ وہ کون سے گھمبیر مسائل ہیں جو ہمیں آج (پاکستان کے مسلم معاشرے میں) درپیش ہیں اور جن کا حل ہمیں ڈھونڈنا ہے۔ ہمارے نزدیک ہمارے اہم ترین مسائل چار ہیں:

i۔ اخلاقی ابتری ii۔ افتراق iii۔ جہالت iv۔ غربت

لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ان مسائل کے حل کے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ عرض کریں، کچھ حقائق کا ادراک اور کچھ تصورات کا صحیح فہم ضروری ہے جن کے بغیر شاید ہماری بات صحیح تناظر میں سمجھی نہ جا سکے:

**اولاً:** یہ کہ بدقسمتی سے ہماری حکومتیں اکثر و بیشتر عامۃ الناس کی خواہشات اور تمناؤں کے برعکس عمل پیرا ہیں اور یہ عموماً یورپ وامریکہ کی دریوزہ گر ہیں جن کی فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے لہٰذا ہم ان بنیادی مسائل کے حل کے لئے صرف اپنی حکومت پر انحصار نہیں کر سکتے۔ اگر چہ ہم ان دینی قوتوں کی حمایت کرتے ہیں جو موجودہ حکومتوں کو مؤثر اسلامی حکومتوں میں بدلنے کی کوشش کر رہی ہیں یا ان پر دباؤ ڈال کر ان سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ ان مسائل کو حل کریں لیکن ان بنیادی مسائل کو بہر حال صرف ایسی حکومتوں کی صوابدید اور رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا جنہیں ان مسائل کے حل سے نہ صرف یہ کہ کوئی حقیقی دلچسپی نہیں بلکہ وہ انہیں اسلام کی بجائے مغربی فکر و تہذیب کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش میں انہیں مزید الجھا رہی ہیں جن سے بگاڑ کم ہونے کی بجائے بڑھ رہا ہے۔ بلکہ ہمیں عوام کی حمایت سے ان مسائل کو صحیح اسلامی تناظر میں حل کرنے کے لئے پرائیوٹ سیکٹر میں خود مقدور بھر کوشش کرنا ہے جس کی وسیع گنجائش موجود ہے۔

**دوم:** 'نفاذِ شریعت' کے بارے میں ہمارے ذہن بالکل واضح نہیں۔ ہمارا عمومی تصور یہ رہا ہے کہ یہ صرف 'حکومت' کے کرنے کا کام ہے۔ چنانچہ پہلے تو بعض دینی عناصر یہ تصور پیش کرتے رہے کہ نفاذِ شریعت کا مطلب ہے 'اسلامی قانون کا نفاذ' اور وہ ہر حکومت سے مطالبہ کرتے تھے کہ شریعت اور اسلامی نظام نافذ کرو مطلب یہ کہ اسلامی قوانین نافذ کرو۔ چنانچہ جب ضیاء الحق صاحب نے 1979ء میں اسلامی حدود نافذ کر دیں تو دینی لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دیں دیتے تھے کہ اسلامی قوانین نافذ ہو گئے ہیں۔ پھر جب ان قوانین پر نہ عمل ہوا اور نہ ان کے خوشگوار اثرات ظاہر ہوئے تو نفاذِ شریعت بذریعہ اسلامی قوانین کے تصور کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ پھر یہ تصور ابھارا گیا کہ ہمارے دنیادار سیاستدان شریعت نافذ کرنے کے نہ اہل ہیں اور نہ اس کی سچی خواہش و جذبہ رکھتے ہیں بلکہ جب علماء اور دینی عناصر کی حکومت آئے گی تو وہ شریعت نافذ کرے گی لیکن صوبہ سرحد میں ملک کے اہم دینی عناصر کو اقتدار مل گیا تو وہاں بھی شریعت نافذ نہ ہو سکی۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس صوبے میں اختیارات کم تھے اگر مرکز میں ہماری حکومت ہوتی تو ہم شریعت نافذ کر دیتے۔ ہم کہتے ہیں کہ ان کو مرکز میں حکومت بنانے کا موقع مل جائے تو بھی یہ مؤثر طور پر شریعت نافذ نہیں کر سکتے سوائے چند قوانین پاس کر دینے یا کچھ سطحی قسم کے ظاہری

اقدامات کر دینے کے۔ کیونکہ شریعت تو معاشرے میں اس وقت نافذ ہوگی جب ہر فرد اپنے آپ کو شریعت کے مطابق بدلنا چاہے گا یعنی جب لوگوں کے ذہن وقلوب بدلیں گے اور اداروں کے اور ان کے چلانے والوں کی سوچ اور ڈھب بدلیں گے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ موجودہ سیاسی نظام، تعلیمی اداروں، میڈیا، پولیس، وکلاء، عدلیہ اور بیوروکریسی کے ہوتے ہوئے اور ان کے ذریعے شریعت نافذ ہوسکتی ہے تو معاف کیجیے وہ جنت الحمقاء میں بستا ہے۔

پس جب نفاذِ شریعت کی حقیقی ضرورت یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن وقلوب کو بدلا جائے اور ان کی سوچ، ان کے کردار اور ماحول کو بدلا جائے تاکہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی احکام پر خوشی سے عمل کرنے لگیں تو اس کے لئے اقتدار کا انتظار کیوں ضروری ہے؟ دینی عناصر عوام کے تعاون سے اور اقتدار کے بغیر، جو بھی وسائل میسر ہیں ان کو استعمال میں لاتے ہوئے یہ کام کیوں نہیں کرتے اور کس نے ان کا ہاتھ پکڑا ہے کہ وہ یہ کام نہ کریں؟ خلاصہ یہ کہ نفاذِ شریعت کا صحیح مفہوم اور طریقہ یہ ہے کہ دینی عناصر کو ایک ہمہ گیر دینی تحریک کے ذریعے تعمیر اخلاق، خاتمہ افتراق، صحیح رخ میں تعلیمی اداروں اور میڈیا چینلز کے قیام اور غربت کے خاتمے کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت سے بھی ان کاموں کا مطالبہ کرتے رہنا چاہیے اور جو لوگ ایک صالح حکومت کے قیام کے لئے عملی کوششیں کر رہے ہیں ان کی بھی حمایت کرنی چاہیے۔

سوم: ہم جس دینی تحریک کی بات کر رہے ہیں اس سے مراد محض علماء کرام کی کوئی نئی جماعت نہیں بلکہ یہ پاکستانی مسلمانوں کے دینی و دنیاوی اہداف کے حصول کی ایک اجتماعی تحریک ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ 'اسلامی' اور 'دینی' کا سابقہ یا لاحقہ اس کے نام کا حصہ ہو، تاہم اس تحریک کا تناظر اور اہداف دینی ہیں اور رہیں گے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے معتدل مزاج علماء کرام جو دین کے عصری تقاضوں کا ادراک رکھتے ہیں یقیناً اس تحریک کا ہراول دستہ ہوں گے لیکن اس کی حقیقی قوت سول سوسائٹی کے اسلام پسند افراد ہوں گے بلکہ ہر وہ مسلمان اس کا فعال حصہ ہوسکتا ہے جو اچھے مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا خواہاں ہو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی اصولوں پر استوار کیے جانے کا متمنی ہو اور دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی چاہتا ہو۔

**چہارم:** مجوزہ دینی تحریک غیر سیاسی ہوگی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ سیاست میں حصہ لینا غیر اسلامی حرکت ہے بلکہ سیاسی قوت کو دینی مقاصد کے لئے استعمال کرنا اور موجودہ سیاسی نظام کی اسلامی حوالے سے اصلاح کی کوشش کرنا ایک اہم دینی ضرورت ہےلیکن مجوزہ دینی تحریک اجتماعی سیاسی قوت کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے کے لئے حسب ضرورت متعدد اقدامات کر سکتی ہےلیکن انتخابی سیاست میں حصہ نہ لے گی کیونکہ آج کل کے معروضی حالات میں انتخابی جدوجہد ایک کل وقتی کام ہے اور اس کے کرتے ہوئے دوسرے اہم دعوتی، اصلاحی اور عملی کام نظر انداز ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے اور مجوزہ تحریک چونکہ ان غیر سیاسی دینی کاموں کو بھی اہمیت دیتی اور اس پر افراد کی صلاحیتیں لگانا چاہتی ہےلہٰذا نہ وہ پاور پالیٹکس میں حصہ لے گی اور نہ کسی کی حریف بنے گی۔

**پنجم:** مجوزہ تحریک بنیادی طور پر دعوت واصلاح کی تحریک ہوگی۔ دعوت واصلاح کا کام نیچے سے شروع ہو کر اوپر کو جاتا ہےیعنی پہلے فرد کی اصلاح، پھر اہل خانہ اور اعزہ واقربا، برادری وقبیلہ، گلی ومحلے کی اصلاح اور پھر اداروں اور ریاست ومعاشرے کی اصلاح۔ معاشرہ افراد سے مل کر بنتا ہے جب افراد کی اصلاح ہوگی تو معاشرے اور ریاستی اداروں کی بھی بتدریج اصلاح ہوتی چلی جائے گی۔

فرد کی اصلاح ہمارے نزدیک بنیادی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ:

☆ قرآن حکیم سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو مخاطبین کی اصلاح کا جو لائحہ عمل دیا گیا تھا وہ تعلیم کتاب وحکمت کے ذریعے ان کے نفوس کے تزکیہ وتربیت ہی کا تھا لہٰذا تبدیلی کا نبوی منہاج بھی یہی ہے کہ فرد کی تبدیلی پر ترکیز کی جائے۔

☆ یہ فرد ہے جسے آخرت میں اپنے اعمال کیلئے جواب دہ ہونا ہے نہ کہ کسی تحریک یا قوم کو۔

☆ معاشرے اور ریاست کے قیام اور ان کی ضرورت واہمیت کی کنہ پر اگر غور کیا جائے تو ہم بالآخر اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ فرد کو راہ راست پر چلنے میں معاونت ملے اور اس کی زندگی سکھ اور سکون سے گزرے۔

☆ دنیا میں آج تک جتنے بھی انقلاب آئے ہیں اور تہذیبیں قائم ہوئی ہیں ان کی اساس فرد میں تبدیلی تھی نہ کہ محض نظم اجتماعی کی بہتری بلکہ اوّل الذکر ایک لحاظ سے ثانی الذکر کی پیشگی ضرورت(PRE-REQUISITE) ہے۔

☆ لاریب اجتماعی تبدیلی بھی اہم اور مطلوب ہے لیکن اس کی بنیاد فرد کی تبدیلی ہے لہٰذا فرد اور اس کی سیرت، اس کی تمناؤں، آدرشوں اور اہداف کو تبدیل کیے بغیر، تبدیلی کو محض ریاستی قوت سے اور اوپر سے تھوپا اور مسلط نہیں کیا جا سکتا اور اگر بالفرض کر بھی دیا جاے تو وہ عارضی اور ناپائیدار ثابت ہوتی ہے لہٰذا معاشرے میں پائیدار تبدیلی لانے کے لئے فرد کی تبدیلی اہم تر ہے۔

خلاصہ یہ کہ مجوزہ تحریک جو تبدیلی پاکستان کے مسلم معاشرے میں اجتماعی سطح پر لانا چاہتی ہے اس کے لئے وہ فرد کی تبدیلی کا راستہ اختیار کرے گی۔

**ششم:** بعض علماء کرام اور دینی لوگوں کو اس مجوزہ تحریک کا لائحہ عمل دیکھ کر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس میں عقیدے کی اصلاح اور نماز، روزے اور داڑھی وغیرہ پر زور نہیں دیا گیا تو یہ کیسی دینی تحریک ہے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو تصور دین شائع اور مروج ہے اس میں علماء کرام ان باتوں پر پہلے سے خوب توجہ دے رہے ہیں اس لئے ہم نے ان پر زور دینا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ تحصیل حاصل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ہاں جو تصور دین بدقسمتی سے شائع اور مروج ہے اس میں دو باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ہمارے ہاں کے سارے مکاتب فکر کے ثقہ اور سنجیدہ علماء کرام خوب جانتے اور مانتے ہیں کہ وہ غلط ہیں لیکن حالات کے جبر نے انہیں نمایاں کر دیا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک تو دین و دنیا کی تفریق کا مسئلہ ہے (جسے آج کل کی زبان میں سیکولرزم کہا جاتا ہے) سارے علماء کرام جانتے اور مانتے ہیں کہ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے اور اسلام اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کا علم بردار ہے لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اگر محلے کے لوگ نماز نہ پڑھیں تو یہ 'اسلامی مسئلہ' ہے لیکن محلے کا ایک مسلمان بھوک سے مر رہا ہو تو 'اسلامی مسئلہ' نہیں ہے۔ ہماری رائے میں یہ غلطی مضمون سب پر واضح ہے دوسری بات یہ ہے کہ آج کل مسلک کو دین کا مترادف سمجھ لیا گیا ہے جو کہ ظاہر ہے سارے سنجیدہ علماء کرام جانتے اور مانتے ہیں کہ غلط ہے۔

غرض یہ کہ دینیاتی امور اور عبادات وغیرہ کو ہم نے بظاہر اس تحریک میں براہ راست

فوکس اور نمایاں نہیں کیا لیکن پوری تحریک کا تناظر اور فریم ورک ایسا رکھا ہے کہ یہ مقصد ان شاءاللہ بالواسطہ طور پر حاصل ہو جائے گا۔

ہفتم: اس وقت ملک میں کئی دینی سیاسی جماعتیں اسلامی حوالے سے سیاست کے میدان میں کام کر رہی ہیں اور بہت سی دعوتی و اصلاحی تحریکیں، تنظیمیں اور ادارے دعوتی و اصلاحی میدان میں کام کر رہے ہیں۔ مجوزہ نئی تحریک ان میں سے کسی کی حریف نہیں ہوگی اور ان پر تنقید اور ان کی تنقیص نہیں کرے گی بلکہ تحریک کا ماٹو سب کے لئے محبت اور ہر خیر سے تعاون ہوگا۔

3۔ اس ناگزیر تمہیدی گفتگو کے بعد آیئے اب مذکورہ چار بنیادی مسائل کے حل کے لائحۂ عمل کی طرف۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے حل کے لئے مجوزہ تحریک کو چار شعبے یا چار طرح کے ادارے قائم اور متحرک کرنے پڑیں گے:

1۔ **تعمیر اخلاق:** اگر آپ دقت نظر سے دیکھیں اور غور کریں تو آپ پر عیاں ہو جائے گا کہ ہمارا اصل بحران اخلاقی ہے۔ حبِّ دنیا، حبِّ مال، حبّ جاہ، جھوٹ، فریب، دھوکہ، رشوت، کرپشن، چوری، ڈاکے، فحاشی، عریانی...وغیرہ ہماری سیرت بن چکے ہیں اور اس اخلاقی ابتری نے ہمیں دنیا میں کمزور، رسوا اور تماشا بنا کر رکھ دیا ہے اور مسلم روایت میں اس کا علاج ہے ایمان اور تعلق باللہ کی مضبوطی اور فکر آخرت لہٰذا اس تناظر میں مجوزہ تحریک لوگوں کے تعمیر اخلاق کے لئے چار سطحوں پر کام کرے گی:

i۔ نسل نو کی تربیت کے لئے تعلیمی اداروں میں صحیح تعلیم و تربیت کا فعال نظام

ii۔ بڑوں (GROWN UPS) کے لئے ایسی تربیت گاہوں کے قیام کی حوصلہ افزائی جن میں فرد میں تبدیلی کے لئے صحبت صالح اور کثرت ذکر جیسے منصوص اور آزمودہ وسائل استعمال ہوں اور جن میں تصوف کی مروّجہ غیر اسلامی رسوم و بدعات قطعاً نہ ہوں۔

iii۔ میڈیا کے ذریعے مناسب ذہن اور ماحول کی تیاری

iv۔ گلی محلے کی سطح پر اخلاق سدھار کمیٹیوں کا قیام جو منکرات کو پھیلنے سے روکیں اور اوامر و معروفات پر عمل کرائیں اور اس کے لئے سازگار ماحول پیدا کریں۔

2۔ **اتحاد:** باہمی افتراق و انتشار نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اختلاف رائے ہم بڑی

مہارت سے دشمنی اور نفرت سے بدل لیتے ہیں اور حق کو صرف اپنی رائے اور مسلک تک محدود اور اس میں محصور سمجھتے ہیں۔ مجوزہ تحریک کا قیام ہی تحمل، بردباری اور اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا مظہر ہوگا کیونکہ اس میں مختلف دینی مسالک اور متنوع سیاسی مکاتب فکر کے لوگ باہم مل جل کر کام کریں گے۔ اس تحریک کا تعلیمی شعبہ بھی کوشش کرے گا کہ دینی تعلیم میں فرقہ واریت اور مسلک پرستی کا رجحان کمزور ہو اور مشترکہ پہلوؤں کو ابھارا جائے۔ اسی طرح اس تحریک کے تحت جو تربیت گاہیں کام کریں گی یا بزنس فورم قائم ہوں گے یا فلاحی مرکز بنیں گے وہ بھی بلا لحاظ دینی و سیاسی مسلک کام کریں گے اور اس طرح قوم میں اتحاد و یکجہتی کی فضا پروان چڑھے گی۔ اسی طرح تحریک بین الاقوامی سطح پر اتحاد امت اور قوموں کے درمیان پُر امن بقائے باہمی کی نقیب ہوگی۔

**3۔ تعلیم اور میڈیا:** جہالت ہمارے معاشرے کا ایک انتہائی بنیادی مسئلہ ہے کہ کم شرح تعلیم نہ صرف بیروزگاری کی سبب ہے اور اس نے سیاسی عمل کی افادیت کو گھنا دیا ہے بلکہ ہمیں اخلاقی و معاشرتی مسائل سے بھی دوچار کر رکھا ہے کیونکہ یہ صحیح تعلیم و تربیت ہی ہے جو دماغوں کو روشن کرتی اور دلوں کو بدلتی ہے۔ ترکی اور انڈونیشیا میں ہزاروں سکول اور بیسیوں کالج اور یونیورسٹیاں وہاں کی دینی تحریکیں چلا رہی ہیں تو پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ لہٰذا تحریک کوشش کرے گی کہ ہر سطح کے ماڈل تعلیمی ادارے قائم کرے (اور موجودہ اداروں کی اصلاح کرے) تاکہ جو طلبہ جدید تعلیم حاصل کریں وہ دینی تعلیم و تربیت سے بھی بہرہ ور ہوں اور اچھے ڈاکٹر، انجینئر ـــــ بننے کے ساتھ ساتھ وہ اچھے مسلمان بھی ہوں اور جو طلبہ دینی مدارس میں اسلام کی تخصصی تعلیم حاصل کریں وہ جدید علوم سے ناآشنا اور عصری تقاضوں سے غافل نہ ہوں تاکہ آج کے معاشرے کی مؤثر رہنمائی کر سکیں۔ ظاہر ہے اس کیلئے نصابات اور تربیت اساتذہ کے موجودہ مناہج پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور تعلیمی اداروں کے موجودہ ماحول کو بدلنا ہوگا جس کا بنیادی نکتہ یہ ہوگا کہ تعلیم اسلامی اقدار کے تناظر میں دی جائے نہ کہ مغربی تہذیب کی اندھی پیروی کرتے ہوئے۔

میڈیا آج کل غیر رسمی تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے جو لوگوں کے اذہان و قلوب اور فکر و عمل پر شدت سے اثر انداز ہو رہا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر جو عناصر مسلمانوں کی راہ کھوٹی کرنا چاہتے ہیں وہ تعلیم اور میڈیا کو اسلام اور اسلامی اقدار سے انحراف کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

اس لئے تحریک نہ صرف اپناٹی وی چینل کھولے گی بلکہ موزوں تعلیم وتربیت سے ایسے ماہرین بھی تیار کرے گی جو ابلاغ کے فن میں مہارت رکھتے ہوں اور اسلامی ذہن بھی رکھتے ہوں تاکہ وہ جہاں بھی کام کریں اسلامی نظریات واقدار کی حفاظت کی کوشش بھی کریں۔

## 4۔غربت کا خاتمہ

مجوزہ تحریک غربت کے خاتمے اور غریبوں کی مدد کے لئے مندرجہ ذیل پہلوؤں پر کام کرے گی:

i۔ بزنس فورم کا قیام: تحریک ان لوگوں کو جو صنعت وتجارت کے شعبے میں کام کر رہے ہیں اور تحریک کے مقاصد سے اتفاق رکھتے ہیں منظّم کرنے کی کوشش کرے گی۔اس سے ان کو اپنی صنعت وتجارت کا موقع ملے گا باہمی روابط اور مواقع بڑھیں گے اور ان کا کاروبار پھلے پھولے گا۔تجارت کے غیر شرعی طریقوں سے بچنے کی مشاورت کے ساتھ ساتھ تحریک ان کو فی سبیل اللہ انفاق پر ابھارے گی اور ایسے شعبوں میں کام کرنے کا مشورہ دے گی جو اسلامی اور ملی لحاظ سے زیادہ اہمیت اورافادیت رکھتے ہیں مثلاً تعلیم ،میڈیا اور دیہی علاقوں میں چھوٹی صنعتوں کا قیام......وغیرہ

ii۔ فلاحی مراکز کا قیام: تحریک گلی محلے کی سطح پر ایک ملک گیر نیٹ ورک قائم کرے گی جو اس علاقے کے کھاتے پیتے لوگوں کی اعانتوں سے ایک فنڈ قائم کرے گا اور اسی علاقے کے مستحق غریبوں، یتیموں، بیواؤں اور بیروزگاروں پر خرچ کرے گا تاکہ ان کے علاقے میں کوئی بھوک سے خودکشی نہ کرے،لوگ بنیادی ضروریات کو نہ ترسیں اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔اس فنڈ سے علاقے میں فری ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی،غریب بچیوں کی شادیاں کی جائیں گی اور دیگر فلاحی کام کئے جائیں گے۔

iii۔ تحریک عموی تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ طلباء و طالبات کے ووکیشنل ٹریننگ سنٹر قائم کرے گی جو تاکہ غریبوں کے بچے وہاں کوئی ہنر سیکھ کر جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔

## مجوزہ تحریک کی ضرورت واہمیت

کسی ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں پہلے سے دینی ادارے، تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں تو اب ایک نئی دینی تحریک کی ضرورت کیا ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کسی جماعت اور تنظیم کے کام کی تنقیص نہیں کرتے لیکن جو تنظیمیں اور ادارے اس وقت موجود

ہیں اور کام کر رہے ہیں ان کی محنت و کوشش کے باوجود معاشرے کے بگاڑ کا وہ حال ہو گیا ہے جو ہمارے سامنے ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ بگاڑ کی قوتیں زیادہ منظّم اور طاقتور ہیں اور ان کے برے اثرات کو رد کرنے کے لئے مزید کوششوں کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ کام کرنے کے جو منہاج یہ جماعتیں اور ادارے اختیار کر چکے ہیں ان کی ممکنہ افادیت تو حاصل ہو چکی اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی کام کے نئے منہاج سوچے اور آزمائے جائیں۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ موجودہ کاوشوں کے ناکافی ہونے کے دو ثبوت اظہر من الشّمس ہیں:

**ایک:** یہ کہ پاکستانی معاشرہ بڑی تیزی سے مغربی فکر و تہذیب کے سیلاب میں بہتا چلا جا رہا ہے اور اسلامی اقدار پر عمل دن بدن کم اور کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ دوم: دینی عناصر کی اصلاح کی موجودہ پُرامن کوششوں کے غیر مؤثر ہونے اور حکومتوں کے ناروا غیر اسلامی رویوں سے مایوس ہو کر اور تنگ آ کر شمال مغربی سرحدی قبائلی علاقوں کے بعض دینی عناصر نے بذریعہ قوت اصلاح کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ حکومت پاکستان اور ان عناصر کے درمیان مسلح جنگ نے خطے کے پیچیدہ حالات اور یورپ و امریکہ اور بھارت کی موجودگی اور مداخلت کی وجہ سے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون بے دردی سے بہہ رہا ہے۔

مطلب یہ کہ مذکورہ بالا حالات یہ ثابت کر رہے ہیں کہ پاکستانی معاشرے کو اسلامی اساس پر قائم رکھنے کیلئے کی جانے والی موجودہ پُرامن کوششیں ناکافی ہیں اور یہ کہ موجودہ حالات پر غور کر کے کام کے نئے راستے نکالنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ چنانچہ ایک نئی دینی تحریک کی ہماری تجویز ایک بہت بڑے خلا کو پُر کر سکتی ہے بشرطیکہ یہ بھرپور قوت سے معاشرے میں روبہ عمل آ جائے۔

## کیا یہ سب کچھ ممکن ہے؟

کئی لوگ یہ تحریر پڑھ کر تبصرہ کریں گے کہ یہ ایک یوٹوپیا ہے، ایک تصوراتی بات ہے جو قابل عمل نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں نہیں، یہ بالکل قابل عمل منصوبہ ہے۔ ایسی تحریک چل سکتی ہے بلکہ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور ایسی تحریک ضرور چلنی چاہیے۔ دیکھئے، آپ کے سامنے مثالیں موجود ہیں خود پاکستان کی مثال لیجیے۔ اکیلا ایدھی زبردست فلاحی نیٹ ورک چلا رہا ہے۔ 'اخوت' کروڑوں کے چھوٹے قرضے دے کر غریبوں کے چولہے جلا رہی ہے اسی طرح کا کام بنگلہ دیش

میں گرامین بنک کر رہا ہے۔انڈونیشیا کی جماعت نهضة العلماء 13یونیورسٹیاں،بیسیوں کالج اور ہزاروں سکول چلا رہی ہے۔ترکی کی نورسی تحریک نے اپنے ملک میں تعلیمی اداروں کا جال پھیلانے کے علاوہ وسط ایشیائی ریاستوں میں 6یونیورسٹیاں اور 300 سکول قائم کر دیے ہیں۔ ان کے 100سکول امریکہ میں قائم ہیں جہاں امریکی بچے پڑھتے ہیں۔غرض یہ نہ کہیے کہ کام نہیں ہوسکتا۔اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوتو اچھی پلاننگ اور مؤثر لیڈرشپ سے یہ کام ہو سکتے ہیں اور ہمارے ملک میں الحمداللہ ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے۔چونکہ اس تحریک کی بنیاد دینی ہے لہٰذا سب سے پہلے ایسے علماءکرام کو سامنے آنا چاہیے جو اس طرح کی تحریک کی بنیاد رکھیں۔اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ ساتھ پھر اگر اخلاص،محنت،حکمت اور جذبہ آپ کے ساتھ رہا تو اس سوسائٹی سے آپ کو ایسے افراد ان شاءاللہ بڑی تعداد میں مل جائیں گے جو اس تحریک کو اُٹھا سکیں۔

**تلخیص مباحث** ہماری گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کو اسلام پر قائم رکھنے کے حوالے سے موجودہ دینی کاوشیں ناکافی ثابت ہورہی ہیں اور وقت کا تقاضا ہے کہ ایک نئی دینی تحریک اٹھے جس کے خدوخال یہ ہوں:

☆ یہ ایک غیر سیاسی اصلاحی تحریک ہو۔

☆ اس میں سارے دینی مسالک،سیاسی مکاتب فکر اور سول سوسائٹی کے لوگ شامل ہوں

☆ یہ تحریک سوسائٹی کے مؤثر طبقات اور افراد کو گراس روٹ لیول پر منظّم اور متحرک کرے، ماڈل تعلیمی ادارے اور میڈیا چینلز قائم کرے، بزنس فورم اور فلاحی مراکز قائم کرے اور ان کے ذریعے تعمیر اخلاق اور غربت و جہالت کے خاتمے کی جدوجہد کرے۔(هذا من عندنا و العلم عندالله)

# LOOSE MORALS GONE WILD!

# اخلاقی گراوٹ درندگی بن گئی

ڈاکٹر ابصار احمد

مترجم : انجینئر مختار فاروقی

آج پوری دنیا بدترین مادہ پرستی کی گرفت میں ہے اور مغربی دنیا اس میں چار قدم آگے ہے۔ بالفاظ دیگر بے یقینی اور روشن خیالی کے اپنے ہی مادر علمی کے آغوش میں یہ (مادہ پرستی) مقابلتاً زیادہ جان لیوا ہے۔ بڑی حیران کن بات ہے کہ ایسی درسگاہیں اور (نام نہاد) اہل علم ہیں جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر بھی 'عیسائی' کہلا سکتا ہے۔

آج کا خدا بیزار یورپی وامریکی 'نظریہ علم' جدیدیت کے زعم میں کسی بھی ایسے غیر مرئی وجود کا انکاری ہے جو کسی بھی اخلاق کی بنیاد ٹھہر سکتا ہو حالانکہ کانٹ جیسے مشہور جرمن فلسفی نے (دوصدی پہلے) اس کو پرزور طریقے پر اپنے فلسفہ اخلاق میں جگہ دی تھی۔ درجنوں تھنک ٹینک اور مغربی اہل علم کی فوجِ ظفر موج ایسی موجود ہے جو دنیا کو یہ باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں کہ پس ماندہ اقوام کا اصل مسئلہ ان کا اپنی روایات سے بہت زیادہ لگاؤ ہے اور اس صورت حال سے نکلنے کا واحد حل ان کا مغربی ترقی پسند انداز اپنانے میں مضمر ہے۔

MODRENISATION THEORY کا یہ لب لباب ہے جس کا لیکچر (اس کے حامی) پس ماندہ اقوام کو قدامت پسندی سے نکال کر MODREN بنانے کے لئے دیتے رہتے ہیں۔ مغرب کا یہ رویہ اس کی خودرائی (اور خود پرستی) سے جنم لیتا ہے اور پس ماندہ اقوام اور معاشروں کا تمسخر اڑاتا (نظر آتا) ہے اور ان کے صدیوں پر محیط شاندار ماضی پر ہتھوڑے چلاتا محسوس ہوتا ہے۔

سوشل انجینئرنگ پروگرام اور ’عالمی معاشرتی ‘اقدار (کی طرف سفر) کے طلسم کی برائیاں (مغرب کی طرح) آج کے پس ماندہ معاشروں کے سماجی (اور معاشرتی) استحکام کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔

اس کے برعکس خود یورپ اور امریکہ کا حال یہ ہے کہ وہاں (علمی دنیا میں) دوبارہ اللہ اور آسمانی ہدایت پر یقین کا تذکرہ ہے۔ایسے (باضمیر) افراد کی ایک طویل فہرست (بنائی جا سکتی) ہے جو (آج) مغربی مرد اور عورت کی روحانیت اور اخلاق سے عاری حالت کو سامنے لا رہے ہیں اور (نتیجتاً بُرے انجام سے ڈرانے کا حق ہمدردی ادا کرنے کے باعث) تباہی اور روسیاہی کے ’پیامبر‘ کے طور پر پہچانے جاتے ہیں (وہ) خاص طور پر (مغربی معاشرے کے مرد و عورت کے) اخلاق اور بلوغت کے بعد (حیوانوں سے بھی بدتر سطح تک) گرے ہوئے رویوں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

ذیل میں ہم ایک (تازہ) کتاب بعنوان "SLOUCHING TOWARDS GOMORRAH" (یعنی ’’قوم لوط (علیہ السلام) جیسے انجام کی طرف لپکتا ہوا معاشرہ‘‘) کے چند اقتباسات نقل کر رہے ہیں جسے امریکہ کی سپریم کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج رابرٹ ایچ بارک نے لکھا ہے جو اوپر درج کردہ تبصروں کو ہم سے زیادہ زوردار انداز میں پیش کر رہے ہیں۔

SLOUCHING ایک مصدر ہے جس کے معنی کسی کا ناواقفیت میں کسی تباہ کن صورت حال کی طرف آنا یا لٹکایا جانا ہے۔اور GOMORRAH اس بستی کا نام ہے جو سدوم (جس سے لفظ SODOMY بنا ہے) کے ساتھ عامورا کے طور پر آتا ہے۔جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان میں بسنے والے انسانوں کی خدا بیزاری اور (حد سے زیادہ) اخلاقی گراوٹ کے کاموں کے باعث مکمل تباہی کا عذاب آیا تھا۔قرآن مجید کے مطابق حضرت لوط علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث فرمایا گیا تھا۔کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ موجودہ امریکی معاشرہ قوم لوط علیہ السلام کی طرح کے اعمال کے سبب سدوم اور عامورا جیسے انجام بد کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

آیئے اس کتاب کے کچھ منتخب حصوں پر نگاہ ڈالتے ہیں:

01۔ یہ کتاب زوال پذیر امریکہ کے بارے میں ہے تاہم امریکی معاشرہ چونکہ تمام مغربی ترقی یافتہ معاشروں کی کامل ترین اور صحیح ترین تصویر ہے لہٰذا یہ کتاب (تہذیب) مغرب کے

زوال کی بھی ( کامل ) عکاس ہے۔

امریکہ کی حد تک کتاب میں درج زوال کی نقشہ کشی اور اس کے خلاف مزاحمتی کوششیں دیکھ کر ایسے لگتا ہے کہ ایک تہذیبی اقدار کی جنگ برپا ہے۔ تاحال یہ کہنا مشکل ہے کہ نتیجہ کیا ہوگا تاہم ابھی حالات کا رُخ تنزل کی طرف ہی ہے ( بقول مصنف ) ہماری تہذیب کا ہر گوشہ ( کئی عشروں سے ) ہر گزشتہ کل سے آج بدتر ہے اور اس کی غلاظت میں اضافہ ہو رہا ہے۔

2۔ 'آج کی مغربی تہذیب' کو ( دشمن کی طرف سے ) کسی جنگ کا خطرہ نہیں۔ سوویٹ روس اور جرمنی کے 'نازی' بے حقیقت ہیں اور نہ ہی یہ خطرہ بیرونی ہے۔ یورپ سے تاتاری ( سلطان محمد فاتح، فاتح قسطنطنیہ و مشرقی یورپ اور طارق بن زیاد کے ساتھ شمالی افریقہ کے جنگجو مسلمان ) فوجوں کو صدیاں گزریں واپس بھیجا جا چکا ہے۔ ( تاریخ کے اس موڑ پر ) اگر ہم دور حاضر کی ترقی اور ٹیکنالوجی کے باوجود جدید DARK AGES میں پہنچ گئے تو یہ ( اپنے ساتھ ) ہمارا خود کردہ عمل ہوگا نہ کہ باہر کی کسی ماضی کی طرح کی فوجوں کی کاروائی کا نتیجہ۔ اس دفعہ یہ ( مہیب ) خطرہ جو ( تہذیب حاضر پر ) حملہ آور ہو چکا ہے وہ ہماری تہذیب کے اندر مضمر ہے اور غالباً یہ ہماری ( بے بنیاد اور خدابیزار ) تہذیب کا اپنا فطری نتیجہ ( یعنی پہلوٹھی کا حقیقی بیٹا )۔

3۔ امریکہ میں یقیناً ( نفسیاتی ) خوف و ہراس کا ایسا دور پہلے کبھی نہیں آیا جیسا آج درپیش ہے۔ جس کے جلو میں 'فرد' کی سطح پر ( قدم قدم پر ) مصیبتیں ( ہی مصیبتیں ) ہیں جو اب ایک معمول بن گئی ہیں۔ جرائم کا گراف اوپر جا رہا ہے اور سزائیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بغیر شادی کے ( عورتوں کے ہاں ) بچوں کی پیدائش کا شمار ہر سال لاکھوں میں ہے جنہیں ویلفیئر کا سہارا ملتا ہے۔ جبکہ بلا وجہ 'طلاق' کی شرح آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ روگ ماضی قریب کے ہیں اور اب یہ بات تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ یہ روگ ( دھوکے میں آزادی اور ترقی سمجھ کر ) گلے لگانا آسان تھا اب اس سے ( صحیح سلامت ) نکل آنا ممکن نہیں ہے۔ درحقیقت ابھی تک کوئی پختہ رائے نہیں بن سکی کہ اس کا علاج کیا ہے؟ اور اگر ہم کسی رائے تک پہنچ بھی جائیں تو دور حاضر کی ( مادر پدر آزاد، امریکی مرد و زن پر مشتمل ) جمہوری حکومتیں شاید وہ تادیبی اقدامات کر ہی نہ سکیں جو ضروری ہیں ( جس کے لئے شاید امریکہ میں مارشل لاء لگانا پڑے جس کا

پاکستان کے پاس بڑا تجربہ ہے۔ترجمہ نگار)

4۔ (ان حالات میں) مایوس کن تجزیوں کی بڑی گنجائش ہے۔ تاہم امید کی کرن بھی موجود ہے۔ (زیادہ تر) تجزیے بتاتے ہیں کہ ہم تیزی سے 'عامورا' (جیسی تباہی) کی طرف لڑھک رہے ہیں اور عین اس 'اخلاقی زوال' کی شاہراہ پر ہیں۔عہد حاضر کے لبرل ازم (جس کے ہمارے پاکستانی معاشرے میں بھی بڑے پجاری ہیں) نے ہمارے معاشرے کو اوپر کی سطح پر کرپٹ کر دیا ہے۔

5۔ ایک طرف اس بات کے کہنے والے امریکی بہت ہیں کہ ہمیں جتنا نیکی کا پرچار کرنا چاہیے اتنا نہیں کرتے۔ دوسری طرف اس بات کے ثبوت بھی کم نہیں کہ اکثر امریکی خود پسندی اور ذاتی لذت کوشی کے ہولناک اثرات کی وجہ سے (انتہائی) بے چینی سے دوچار ہیں اور اس کے سبب ہم (بحیثیت قوم) 'عامورا' (جیسی تباہی) کے کنارے آن پہنچے ہیں (جہاں ذاتی لذت کوشی کے سوا کسی کو کسی کی کوئی فکر نہیں ہے) جس کا لامحالہ فوری 'تحفہ' یہ ہے کہ (امریکی تہذیب پر) بڑھتے ہوئے جاہلانہ رویّے، شدت پسندی، مایوسی اور خودغرضانہ سوچ کے گہرے سائے ہیں۔

6۔ (جہاں تک اصلاحی تدابیر کا تعلق ہے) پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم (ٹھنڈے دل سے) غور کریں کہ ہمارے ساتھ ہو کیا رہا ہے؟ اس کتاب میں اس سوال کا جواب تلاش کر کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ زوال اور تنزل کے اثرات معاشرے کے ہر طبقے میں ہیں اور اس زوال کی واحد اور مشترک وجہ 'لبرل ازم' یعنی مادر پدر آزادی کی سوچ ہے۔

7۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ لبرل ازم (مادر پدر آزادی) اور خالص ایگالیٹرزنم (ذاتی خود غرضانہ زندگی) کی ہر محاذ پر (سخت) مزاحمت کا رویہ۔ یہ سوال بے جا ہے کہ کوئی ایک حل ہونا چاہیے۔ یقیناً کوئی ایک بڑی یک رُخی مہم اس کا علاج نہیں ہے ہمیں ہر خرابی کے لئے (موقع بہ موقع) علیحدہ سوچ کا انداز اپنانا ہوگا۔ ہر 'چرچ' سے 'مذہب' کے احیاء کا نعرہ ضروری ہے۔ ہر یونیورسٹی اور سکول بورڈ کی سطح پر بھی (یہی نعرہ ہو)۔ (اس لئے کہ آزادی کی بنا پر کسی کو فوری طور پر مذہب کے احیاء کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا)۔ (ریاستوں کی) انتظامیہ اور سرکاری ملازمین کو

(مذہب کی) نکیل ڈالی جائے (اور اخلاق و کردار کا پابند بنایا جائے)۔(پاکستان میں بھی اس کی ازحد ضرورت ہے۔ترجمہ نگار)

عدلیہ پر بھی گہری نگاہ رکھی جائے اور اپنے آئینی حدود سے تجاوز کے معاملات پر اس کی سخت تنقید کی جائے جیسا کہ آج کل (امریکہ شریف میں) اکثر ہوتا ہے۔(الحمداللہ امریکہ سے بہت پہلے ہمارے ہاں عدلیہ اور عوام کو اس ضرورت کا بروقت احساس ہو گیا ہے۔ترجمہ نگار) (عوامی سطح کی) اس مہم میں کئی اقدامات کے لئے حکومت کا بھی سہارا لینا ناگزیر ہے جیسا کہ ہمارے مروّجہ تہذیبی آزادیوں کے تحت 'غیر مہذب' طور طریقوں پر پابندیوں کا اجراء وغیرہ۔

8۔ (افسوس کہ) ہم نے خود امریکہ کے ذہنی سرمایہ اور سنہرے اخلاقی اصولوں کی شدید توڑ پھوڑ کی پر مجرمانہ چشم پوشی کی (اور یہ سب کچھ حالیہ مغربی لبرل ازم کی ہی تباہ کاریاں ہیں۔) اگر ہم جذبات سے بلند ہو کر سوچیں اور حقائق پہچانیں تو ہماری موجودہ روش کا نتیجہ، مایوسی کی فضا میں تو 'عامورا' (کی تباہی) سے مشابہ ہی نظر آئے گا۔تاہم صورت حال لاعلاج نہیں ہے۔

ہمارے پاس (اس کم وقت میں) جو مہلت عمل ہے اس میں ایک عزم مصمّم کہ 'تباہی' ہمارا مقدر ہو' یہ ہمیں قبول نہیں اور اس کے لئے ایک (چٹان کا سا) عزم کہ ہم RESIST کریں گے اور ہمارے پاس یہی (قوموں کی) قوت ادادی کی (گرانقدر) قوت ہے (جس کے بعد اللہ تعالیٰ قوموں کے حالات بدل دیتا ہے اور اس عزم مصمّم کی امریکہ سے زیادہ پاکستان کے بہی خواہوں اور قیام نظام خلافت کے داعیوں کو ضرورت ہے۔اللہ ارزائی فرمائے آمین۔)

# باکمال اساتذہ

زیرادارت ونگرانی: مولانا عبدالقیوم حقانی

جہدِ مسلسل، اخلاق و عادات، زہد و قناعت، ذہانت و فقاہت، تقویٰ و دیانت، ذوق مطالعہ و تحقیق، انداز درس و تدریس، اظہار مافی الضمیر، ملکۂ تفہیم و تشریح، طلبہ کی ذہنی سطح کا لحاظ، سلیقۂ تعلیم و تربیت، خصوصیات و امتیازات، اضافی ذمہ داریوں کے باوصف اوقات کی پابندی اور تدریس کا اہتمام۔

ماہنامہ القاسم خصوصی اشاعتوں کے حوالے سے اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے باکمال اساتذہ، ماہرین علم، تعلیمی مربیین، ان کے اندازِ تعلیم و تربیت اور ان کے احساناتِ علم و قرطاس کو اجاگر کرتے ہوئے ''اساتذۂ کرام نمبر'' پیش کرنا چاہتا ہے، جنہوں نے صعب ترین اور شکل حالات کا سامنا کرتے ہوئے علم کا چراغ روشن رکھا، جو تمام قارئین بالخصوص نونہالانِ قوم اور نسلِ نو کے مستقبل کے لئے رہنما لائحۂ عمل اور روشن مستقبل فراہم کرے گا۔

علم و قلم سے وابستہ تمام حضرات و خواتین اپنے وقت کے بہترین اساتذۂ کرام و محسنین کی سیرت و سوانح پر قلم اٹھائیں، دنیا کو ان کے علمی کارناموں، فنی، تعلیمی و تربیتی عظمتوں اور قلمی کارناموں سے آگاہ کریں۔

القاسم کے قدیم وجدید قارئین کو نصف قیمت اور دیگر شائقین کیلئے ۳۳ فیصد کی رعایت ہوگی

ماہنامہ القاسم، جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ PC:24100
سرحد پاکستان رابطہ کیلئے: 0346-4010613

## مدیر کے نام

بعد از سلام مسنون

حکمت بالغہ بابت ماہ فروری 10ء کا شمارہ موصول ہوا اول تا آخر پڑھا ''کامل اتباع رسول ﷺ'' کے عنوان سے قیام نظام خلافت کی جدوجہد کے ساتھ روزمرہ کی زندگی میں التزام اتباع رسول ﷺ کی طرف جو توجہ دلائی ہے وہ اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ افراد بھی اور جماعتیں بھی دین کے کسی ایک پہلو پر تو بہت زور دیتی ہیں لیکن دین کے دوسرے پہلوؤں کی مناسب توجہ سے محروم رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بظاہر بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہو رہا دین ایک خاص عقیدے و نظریے اور طرز عمل کا نام ہے اور اس کا اصل ماخذ قرآن و حدیث ہیں نبی ﷺ کا اُسوہ اسی قرآن و حدیث کی عملی شکل ہے اس میں شک نہیں کہ عملی طور پر اس اُسوہ کی تفصیلات میں فرق و تفاوت ہے بعض حصے فرض، بعض واجب اور سنت ہیں جن کا علمی ادراک ضروری ہے لیکن عملی طور پر یہ سب ایک ناقابل تقسیم وحدت کے اجزاء ہیں اور ہر جز اپنی جگہ پر بہت اہم اور لابدی ہے جو خیرات و برکات اس مجموعہ پر مرتب ہوتے ہیں وہ ادھورے دین پر ہرگز مرتب نہیں ہوتے۔ دین میں آداب و مستحبات کا کیا درجہ ہے اس کے لئے عبداللہ ابن مبارک رحمہ اللہ کا یہ ارشاد کس قدر وقیع اور معنی خیز ہے:

مَنْ تَهَاوَنَ بالآداب عُوقِبَ بِحرُمَانِ السُّنَنِ وَ مَنْ تَهَاوَنَ بِالسُّنَنِ عُوقِبَ بِحرمَانِ الْفَرائِضَ

''یعنی جس نے آداب کی بجا آوری میں تساہل برتا وہ مآلِ کار سنتوں سے محروم ہو جائے گا اور جس نے سنتوں کی ادائیگی میں سستی دکھائی انجام کار فرائض سے محروم ہوگا''

قرآنی ارشاد ''صبغة اللّٰه'' کی شان آداب و مستحبات ہی کے التزام سے وجود میں آتی ہے اور انسانی سیرت میں جذب اور کشش پیدا ہوتی ہے اس کے بغیر دین کا پودا نضارت اور تروتازگی سے محروم اور کماحقہ کے درجے میں پھل و پھول سے بے بہرہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُسوۂ کاملہ کی پیروی نصیب فرمادے۔ دُعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی تحریری کاوشوں کو مزید فروغ و جلاء بخشے اور خلق خدا کی ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنادے۔ آمین ثم آمین

(الطاف الرحمٰن بنوی)　　جامعہ امداد العلوم پشاور صدر

یہ تحریر ختم کرنے بعد یاد آیا کہ مضمون میں ایک جگہ تساہل کا شک گزرا تھا آپ نے سورۃ یٰسین کی آیت والقرآن الحکیم کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس جملہ میں مقسم علیہ محذوف ہے۔ میں نے اس بارے میں کسی تفسیر کی طرف رجوع تو نہیں کیا لیکن یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ مقسم علیہ کے حذف ماننے کی ضرورت کیا ہے اس کے بعد آنے والا جملہ '' اِنَّکَ لَمِنَ المُرسَلِین ''کو مقسم علیہ کیوں نہیں قرار دیا جاتا۔ کسی جملہ میں محذوف ماننا خلاف اصل ہے اس کا ارتکاب ضرورت کے وقت ہوتا ہے یہاں محذوف ماننے کی ضرورت سمجھ ہی نہیں آتی۔ واللہ اعلم

## ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے لئے

تمام کفر کی دنیا کھڑی ہے اک جانب تو ایک عافیہ تنہا کھڑی ہے اک جانب
میں کیا کہوں تجھے اے عافیہ!تو ناداں ہے یہ جرم کافی ہے تیرا کہ تو مسلماں ہے
ترا یہ جرم کہ تو اس قدر ذہین ہے کیوں زمیں پہ رہتے ہوئے آسماں نشیں ہے کیوں
تری یہ جرأت اظہار تیری دشمن ہے بھلا تو کس لئے امریکیوں سے بدظن ہے
ترے مزاج میں تلخی بھری بغاوت ہے ترے عمل سے ہویدا تری شجاعت ہے
تجھے یہ عدل ملا ہے نہ یہ عدالت ہے یہ اہل حق سے فقط کفر کی عداوت ہے
سو ظلم و جبر کی طاقت تجھے جھکا نہ سکی صراط حق سے ذرا سا تجھے ہٹا نہ سکی
پہاڑ ظلم کے تجھ پر جو آہ ٹوٹے ہیں ہر ایک آنکھ سے رہ رہ کے اشک پھوٹے ہیں
گلہ میں کیسے کروں اپنے حکمرانوں سے نہیں ہے اٹھنے کا یہ بوجھ ان کے شانوں سے
یہ بے بصر ہیں ، انہیں کچھ نظر نہیں آتا جو راہبر ہے ، وہی راہ پر نہیں آتا
نہ اشک آنکھ میں باقی'نہ دل ہے سینے میں ہے فرق کیا مرے مرنے میں اور جینے میں
یہ چند الفاظ ہیں تیرے لئے میری بہنا! مجھے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہنا
یہ کربلا کا سفر ہے جو اب بھی جاری ہے کہ ایک شخص یہاں لشکروں پہ بھاری ہے

(ماخوذ از ماہنامہ خطیب لاہور مارچ 2010ء) سعد اللہ شاہ